قیدی سانس لیتا ہے

قیدی سانس لیتا ہے

زاہدہ حنا

قیدی سانس لیتا ہے

بار اوّل ـــــــــــــــ ۱۹۸۳
بار دوم ـــــــــــــــ ۱۹۸۵
بار سوم ـــــــــــــــ ۱۹۹۰

ناشر:۔ "روشن خیال" E.1 جنید پلازہ، راشد منہاس روڈ گلشنِ اقبال کراچی ۴۷
پرنٹر: احمد پرنٹنگ کارپوریشن ـــــ ناظم آباد ـــــ کراچی ۱۸

قیمت: ـــــــــ ۶۰ روپے

واحد تقسیم کار
کتابیات پبلی کیشنز ـ پوسٹ بکس نمبر ۲۳ کراچی ۷۴۲۰۰

جہلم کے نام

جو میرا محبوب ترین شہر ہے کہ جب
میرے پرکھ
مرزا اطہر بیگ
(ڈاکٹر شاہ)
نے ۱۸۵۷ء میں فرنگیوں کے خلاف بغاوت کی
اور سولی پائی تو اس کے لوگوں نے ان کے
لاشے کو بچایا اور اپنی مٹی میں آباد کیا

سرحرف

گزشتہ چند برسوں سے اُردو کہانی انسان اور زمین سے بچھڑ گئی ہے۔ حالانکہ انھیں برسوں میں تمام تر جبر کے باوجود وطن کے لوگوں کا شعور اتنا بڑھا ہے کہ انکی نظر میں عدلیہ، فوج، خاندان اور عقیدے جیسے بڑے ادارے محض مذاق ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایران و افغانستان زمبابوے، نکاراگوا اور کتنے ہی دوسرے دیسوں کے لوگ موت کے بے صدا حلقے کو توڑ کر، اشیا سے انسانوں کے منصب پر فائز ہو گئے ہیں اور انھوں نے آواز کا ذائقہ چکھا ہے۔ اردو میں کہانی لکھنے والا اس قومی اور بین الاقوامی شعور کی طرف سے آنکھیں بند کیے بیٹھا آدمی یا انسان اور اس کے دُکھ اور اس کی جدوجہد اور اس کی شہادت اور اس کی فتح کا باب لکھنے کی بجائے محض چھپکلی کی رینگتی کراہت رقم کر سکا۔ اُس نے اپنی موجودگی کو اور انسان کو ترک کر دیا۔ اس نے وجود کا ترجمہ عدم کیا اور خوف کا پرچار کیا۔ اُس نے تنہائی کو صنم FETISH بنا دیا۔ وہ اُس فقیر سے مشابہ نظر آیا جو اپنی پنڈلی پر کلیجی باندھ کر بیٹھ جاتا ہے اور ہر آنے جانے والے کو یہ زخم دکھا دکھا کر بھیک مانگتا رہتا ہے۔ یہ تنہائی غدود کی خرابی یا اس کے دباؤ میں کمی یا زیادتی سے پیدا ہوتی ہے۔ زندگی اور حُسن سے، مادر زاد، نفرت سے پیدا ہوتی ہے۔ بینک بیلنس پر ہر وقت نگاہ رکھنے سے پیدا ہوتی ہے، وطن کے بیٹوں کو ٹارچر کیمپوں میں مار دیے جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوتی ہے کہ اسرائیل کی جیلوں میں P.L.O. اور P.F.L.P. کے یہودی حامی بھی قید ہیں۔ چنانچہ انیس ناگی، ڈاکٹر انور سجاد اور چند ایک دوسرے افسانہ نگاروں کے کام کو چھوڑ کر، گذشتہ پانچ دس برسوں میں اردو کہانی میں جو کچھ بچتا ہے، وہ زوال ہے۔ عقیدہ ہے۔ ہیئت ہے۔ جدیدیت ہے۔ مغائرت ہے۔ چاپلوسی ہے۔ مجرمانہ چُپ ہے اور یہ سب سی آئی اے کے ذیلی عنوانات ہیں۔

اور زاہدہ حنا اور اس کی کہانیاں، چند سال پیشتر میں نے اس کی کہانی "زیتون کی ایک شاخ" پڑھی تھی اور میرا خیال ہے کہ زیتون کی اس بریدہ شاخ کا نام ایڈگر ہے تو دوسرا زاہدہ حنا بھی ہو سکتا ہے اور دونوں کا انتخاب زندگی ہے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ پابیادہ اور خون آلود بدن سے جینے کی تصدیق کرتے ہیں اور انھیں پہلی بار یہ ادراک ہوتا ہے کہ امریکی بھی انسان ہو سکتے ہیں اور وہ بھی جنگ، محبت، بے وفائی اور موت کے دُکھ اٹھاتے ہیں۔ جبری فوجی بھرتی کے بعد وہ ویت نامیوں کو قتل کرنے کے لیے روانہ کیے جاتے ہیں اور اس لیے مر جاتے ہیں کہ جینا اچھا ہے۔ یہ کہانی ایک بڑے کینوس پر پھیلی ہوئی ہے اور انسانوں اور کرائے کے قاتلوں کے درمیان امریکی عوام اور امریکی سامراج کے درمیان نازک سے لیکن ایک بڑے اور اہم فرق کی نشاندہی کرتی ہے اور قاری اداس ہو جاتا ہے۔ دل اور ذہن اور اداسی کا رنگ بھورا ہے۔ اور افسانہ اپنے طلوع ہونے کے امکان کو آشکار کرتا ہے۔

پھر میں نے زاہدہ حنا کی کئی کہانیاں پڑھیں۔ لگتا ہے وہ مجبور ہے کہ زندگی اور آزادی کا انتخاب کرے۔ اس کی کہانیوں میں انسان کی موت زندگی کے اسی انتخاب کے سبب واقع ہوتی ہے۔ اُسے اس لیے مار دیا جاتا ہے کہ وہ دریا میں بہتی ہوئی ایک بے بس موج نہیں ہے اور ٹارچر کیمپ میں بھی ثابت قدم ہے۔ آزادی! وہ یہاں سے ابتدا کرتا ہے کیونکہ جو آزاد ہوگا اس پر پابندی ہوگی کہ وہ آزادی کا فیصلہ کرے اور یہ فیصلہ اسے خود کرنا ہوتا ہے۔ یہی "بود و نبود کا آشوب" ہے۔ وہ اس پر تشدد کرتے ہیں۔ اس کی انگلیوں کے ناخن کھینچتے ہیں گھنٹوں برف کی سل پر لٹاتے ہیں۔ اسے چوپایوں کی طرح چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ برہنہ کر کے غلاظت کے تالاب میں غوطے دیتے ہیں۔ پیروں میں وزن باندھ کر اور کلائیوں کو آہنی حلقوں میں جکڑ کر چھت سے لٹکاتے ہیں اور پھر جھنجھلا کر اسے ہلاک کر دیتے ہیں۔ اور ان کا آشوب یہ ہے کہ مرنے والا موت کی نہیں، زندگی کی تصدیق کرتا ہے۔ ان کی کراہت انگیز حرکتوں پر ہمارا جی متلاتا ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ ان سے محبت کرنے کا انتخاب بھی ہم نے خود کیا تھا۔ اور اب اس میں یہ پیکار بھی شامل ہو گئی ہے کہ انسان تشدد کے باعث نہ مرے، قبل از وقت نہ مرے اور وہ کہ جنھیں ضمیر کے بندھن سے آزاد کر دیا گیا ہے انسانوں کی قبل از وقت ہلاکت کے لیے فوجی اعزاز سے نوازے جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ مرنے والے کو، اپنے دشمنوں کی طاقت سے ایک مخصوص اور تقریباً مطلق آزادی حاصل ہوتی ہے۔

پچھتاوا، پچھتاوا، پچھتاوا۔ جب ہر چیز کو فنا کا ذائقہ چکھنا ہے تو پھر، سب چیزیں کیوں ہیں؟ بیروت؟ موئنجو ڈرو؟ کیا فرق پڑتا ہے۔ ہجرت جبر ہے۔ یوسف نوبختی کی ہجرت سمیت ساری ہجرتیں جبر ہیں۔ انسان صرف زندگی کا اختیار رکھتا ہے اور یاقوت پیر بھٹی کی طرح اس

صدا ڈاکٹر خورشید الاسلام

کا اظہار کر سکتا ہے لیکن جب عورتیں اپنا دل ہارتی ہیں تو مر جاتی ہیں اور اگر بہادر ہوں تو کہانیاں لکھتی ہیں "مرحرے اماں کے ساتھ" جیسی کہانیاں۔ کہ انتظار کو انتظار کے مقابل دیکھنے کے لیے کہانیاں لکھنا ضروری ہے جب کہ کائنات میں انتظار کہیں نہیں ہے اور کتنی عجیب بات ہے کہ آغاز ہی انجام ہے۔ آنکھیں اس کے دیدبان ہیں۔ اب وہ اپنی ذات کے حصار سے باہر کیسے آئے؟ میرا جواب ہے کہ یہ سوال ہی غلط ہے۔ اس حصار کو اس نے کئی بار توڑا ہے۔ ایک بار زبیدہ بن کر بھی، اسی لیے تو وقت بھی اس سے ہار گیا تھا۔

یہ کہانیاں زمین اور انسان کی دھڑکنیں ہیں۔ وہ موت کی منکر ہیں۔ ہر وقت، ہر جگہ۔ بغداد میں، ہائی بھونگ میں، کراچی میں قتل گاہوں میں، مہاجر کیمپوں میں، نویں صدی میں، بیسویں صدی میں، ۱۹۶۹ء میں، ۱۹۸۰ء میں۔ اور یہ کہانیاں، زمان و مکان کی تمام حدوں کی منکر ہیں۔

اپنی کہانیوں میں زاہدہ نے، مجھ سمیت اپنے تمام پڑھنے والوں سے درد کا نہیں، درد کے شعور کا اشتراک کیا ہے۔ دُکھ کو اس نے پرچم نہیں بنایا لیکن اسے محض دُکھ بھی نہیں رہنے دیا۔ وہ دکھ کو شعور میں اس لیے تحویل کر سکی کہ اس کے یہاں الم ہے، الم پسندی نہیں۔ اس کے یہاں فکر اور شعور کی بنیاد مادی ہے۔ قبل تجربی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ساری واردات تجربے پر قائم ہے۔ خارجی دنیا کی صداقت پر، مادی حقیقتوں پر، معیشت کے بے رحمانہ تضادات پر، بھوک پر، اسراف پر، رشتوں پر اور انسان پر۔ لیکن اس مادیت پسندی کا روحانی پہلو یہ ہے کہ اگر زاہدہ سے میرا ذاتی دوستی کا تعلق نہ بھی ہوتا، تب بھی یہ کہانیاں اور ان کہانیوں کا درد اور اس درد کا شعور زاہدہ حنا کے اُسی وجود کو میرے سامنے لاتے، جو وجود اب حقیقتاً میرے سامنے موجود ہے۔

"موجود ہے" کہنا اپنی جگہ پر ایک بڑا دعویٰ ہے۔ اس لیے کہ یہ "انسان موجود ہے" کی طرح کوئی آفاقی کلیہ نہیں جس کی صداقت کو چیلنج نہ کیا جا سکے۔ میرا کہنا صرف اتنا ہے کہ زاہدہ کی موجودگی کا ثبوت، اُس کی کہانیوں کی یہ کتاب ہی نہیں، خود زاہدہ کی ذات بھی ہے جو ایک مادی وجود رکھتی ہے۔ زمین پر چلنے والا اور اس طرح چلنے والا وجود کہ زمین پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ زاہدہ کی نرمی، نرم روی، نرم گفتاری، اُس کا دھیما پن۔ ان باتوں سے مجھے کئی بار ڈر لگا ہے کہ اتنی آراستہ و پیراستہ قسم کی نرماہٹ اور خوفناک قسم کی منافقت کے بیچ بہت معمولی فرق ہوتا ہے۔ وہ انسانوں سے (جن میں دوست بھی شامل ہیں) اس احتیاط سے بات کرتی ہے جس احتیاط سے وہ تتلیوں اور پھولوں اور زمین کو چھوتی ہو گی۔ وہ اپنے کئی جملے ادھورے چھوڑ دیتی ہے کیونکہ وہ ادھورے جملے کے ردِ عمل کو پورے جملے کا ردِ عمل بنانے کے حق میں نہیں ہوتی۔ وہ اپنی بات یا عمل سے، دوستوں کے دکھی ہو جانے کے خوف میں اس قدر مبتلا رہتی ہے کہ کبھی کبھی اس کی حد سے بڑھی ہوئی یہی احتیاط دُکھ دے جاتی ہے۔ چھوٹی سی مثال ہے، یہ حقیر سی چند سطریں جنہیں بلا کسی تاخیر کے قلم برداشتہ لکھا جا سکتا تھا، ہفتوں تک محض اس لیے نہ لکھی جا سکیں کہ زاہدہ کا تقاضا ایسے ہوتا تھا، جیسے بی بی معافی مانگ رہی ہو۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کی بغل میں چھری کی بجائے چڑیا کا ایک زخمی بچہ چھپا ہوا ہے۔ اس موضوع پر زاہدہ سے میں نے کبھی بات نہیں کی لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بندے کے اندر کی نیکی کو اتنا ابدی سمجھتی ہے کہ اپنا رویہ ترک نہیں کرے گی۔

زاہدہ حنا سے پہلا تعارف، جون ایلیا کے ذریعے ہوا تھا لیکن یہ تعارف برسوں تک تعارف ہی رہا، دوستی نہ بن سکا۔ صرف گذشتہ چار پانچ برسوں میں مجھے اس سے ملنے، باتیں کرنے، سننے اور بولنے کا زیادہ موقع ملا۔ میں نے اس کی فقیری میں امیری اور امیری میں فقیری دیکھی ہے، اگرچہ زیادہ تر وہ فقیری بھیس میں ہی نظر آئی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ نہ وہ فقیروں کی طرح فقیر ہے نہ امیروں کی طرح امیر۔ اپنے فقیری دور میں بھی وہ گاڑی اسی احتیاط سے چلاتی ہے، اسی اطمینان سے کہانیاں لکھتی ہے، اتنے ہی وثوق سے فیصلے کرتی ہے، اُسی اعتماد سے دھوکا کھاتی ہے۔ اتنی ہی دردمندی سے دوستوں کی بات سنتی ہے اور اسی حوصلے سے اپنے بچوں کو بازوؤں میں چھپا لیتی ہے، صرف کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اسٹیئرنگ پر اس کا ہاتھ کانپ جاتا ہے یا ٹیلیفون پر اس کے بول کانپ جاتے ہیں یا انگلیوں کی پوروں میں سوئی ٹوٹ جاتی ہے لیکن ان واقعات کا صرف زاہدہ حنا کو علم ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے کرداروں کا انتخاب اسے رسوا کیے بغیر نہیں رہتا۔

اور جنگلے سے، پولیس کی گاڑی میں، اپنے دوستوں کے چہرے نہیں، ان چہروں کی کترنیں دیکھنا کیسا تجربہ ہے؟ اور "منھنجو مشاھو" کہہ کر زندگی سے لپٹ جانا بھی؟ لیکن سندھ کے لوگ شاید اس تجربے کو زندگی اور موت کی طرح جی رہے ہیں۔ رنگین کپڑوں کی کترنوں سے بنائی ہوئی رلیاں بظاہر ہماری زندگی میں کوئی مفہوم نہیں رکھتیں لیکن جب ہم اپنی زندگیوں میں اس سوال کا سامنا کرتے ہیں کہ جن بھی زمینوں سے ہم آئے ہیں، ان سے شدید محبت کے باوجود، اس زمین سے، جو اس وقت ہمارے پیروں تلے ہے، ہمارا کیسا رشتہ ہے؟ تو رنگین کترنوں کی رلی ہمارے لیے ایک گہری معنویت اختیار کر لیتی ہے۔ معنویت، جو ہمیں باہر سے نہیں، اندر سے، اپنے لوگوں کے ساتھ جوڑ دیتی ہے۔ "رنگ تمام خوں شدہ" میں زاہدہ ایک طرف قحط زدہ تھر کی ایک بچی سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے تو دوسری طرف لاہور

کی تہمینہ سے۔ اور دونوں جگہ یہ رشتہ وہ دراصل اپنے آپ سے بناتی ہے۔ میں نے کہا نا کہ کرداروں کے انتخاب نے رسوا کیا اُسے، اور اسی سبب سے سہسرام سے جہلم کے پانیوں تک اور کراچی سے سندھ کے ریگزاروں تک، اس نے ہر جگہ لہو کے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا ہے۔

جب میں زاہدہ کی ذاتی زندگی کو، اس کی کہانیوں سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو ناکام ہوتا ہوں۔ میری یہ ناکامی ہی میری کامیابی ہے۔ زاہدہ حنا کے یہاں آرٹ اور شخص کی یہ وحدت الوجود، قیدی کے سانس لینے سے اس کی سانس کے اکھڑ جانے تک ہے اور اکھڑی سانسوں کے ساتھ اپنی انگلیاں اور دل لہو میں ڈبونے کی جدوجہد تک ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ زاہدہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں، اپنے لہولہان لیکن لڑتے، جدوجہد کرتے آرٹ سے بظاہر بے تعلق نظر آتی ہے لیکن اس بے تعلقی میں تعلق کا، وابستگی کا کمٹ منٹ کا ایک عالم آباد ہے جو وقت سے ورا ہے کہ ایک سطح پر زاہدہ کا مکالمہ اپنے بچوں، اپنے دوستوں، اپنے پیاروں سے زمان و مکان کی حدوں کے اندر ہوتا ہے تو دوسری سطح پر ماضی کے صدیوں پر محیط اس جذبے سے، اور اُس دانش سے، جو پچھلی صدی ایک جرمن فلسفی میں سمٹ آئی تھی۔

اس کی زندگی کے اہم حوالوں میں، ایک حوالہ میرا جہلم ہے، جہاں زاہدہ کے پرکھ مرزا دلدار بیگ لوگوں کے دلوں میں اور اُن دلوں کے رنگ جیسی مٹی میں جیتے ہیں۔ یہ حوالہ، زاہدہ سے میری دوستی کا ایک اہم حوالہ ہے۔ اسی لیے زاہدہ کا یہ کہنا غلط ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ کیونکہ مرزا دلدار بیگ نے اور بوڑھے جرمن فلسفی نے محبت کی اور اس روشنی کا عرفان پایا۔ اس بوڑھے جرمن کی سب سے محبوب عورت جینی نے محبت کی اور اپنے شوہر کے پہلو میں بیٹھ کر آنگن کی مٹی کھودی اور اپنے بچے کو اس میں بغیر کفن کے لٹا دیا۔ اس محبت کی آنکھیں تھیں، ہیں اور ان آنکھوں کی پہچان اندھی آنکھوں سے نہیں ہو سکتی۔

اِس محبت کو میں نے ہزار رنگ میں دیکھا ہے۔ یہ محبت اُس پل بھی سانس لیتی ہے جب اپنے گھر اور بچوں کے لیے اسے بے کیف اور تھکا دینے والے کاموں سے گذرنا پڑتا ہے۔ کئی بار، ان کاموں کے بوجھ تلے دفن ہو کر بھی وہ طلوع ہوتی ہے۔ کہانی لکھنے کے لیے، اختلاف کرنے کے لیے، ایک آزاد عورت (انسان) کے طور پر جینے کے لیے..... اور یہ حق وہ دوسروں کے لیے بھی محفوظ رکھنا چاہتی ہے کہ کہانیاں لکھی جائیں، عورت یا مرد کی سطح سے انسان کی سطح تک بلند ہوا جائے، اختلاف کیا جائے لیکن لوگ اس سے اختلاف نہیں کرتے، اُس سے جھوٹ بولتے ہیں۔ اسی لیے وہ کہانیاں تخلیق نہیں کرتے، کہانیاں بناتے ہیں۔ اسی لیے وہ انسان کی سطح تک بلند نہیں ہوتے اور نہیں جیتے، صرف ناٹک کھیلتے ہیں جینے کا..... اس سب کچھ کے جواب میں زاہدہ کے پاس تلخی نہیں ہے، درد ہے کیونکہ کہیں وہ عذرا ہے اور پھر خود ہی کہیں تہمینہ ہے۔ وہ جانتی ہے کہ فصیلوں میں جلی ہوئی تیلیوں سے نقب نہیں لگتی اور آسمان پر سے برستے ہوئے خوف کے تلے تاریخ کی جدلیاتی تعبیر، کٹ جانے والی انگلیوں سے ہی رقم کی جا سکتی ہے۔

زاہدہ حنا محبت کرتی ہے کہ عورت ہے، کہانیاں لکھتی ہے کہ بہادر ہے۔ وہ کبھی ختم نہ ہونے والے سفر میں ہے اور یہ سفر اختیار کا انتخاب کا سفر ہے۔

اِس سفر میں اس کے پاس سیاہ اوڑھنی ہے، ابھی تک.....

احمد سلیم

۲۱، فروری ۸۳ء

زح

عورت ہونا، کہانیاں لکھنا، اختلاف کرنا، یہ ہمارے معاشرے کی تین خرابیاں ہیں اور میں ان ہی کا مجموعہ ہوں۔ اسی لیے بہت کج مج ہوں، بہت بے ڈھب ہوں۔ میری لکھی ہوئی کہانیاں بھی اتنی ہی کج مج اور بے ڈھب ہیں۔ مجھے اپنے باب میں نہ کوئی خوش فہمی ہے اور نہ کوئی دعویٰ ہے۔ جیسے سوئی کی نوک سے گوشت میں اُتری ہوئی پھانس نکالی جاتی ہے اور پھر سکھ کا سانس لیا جاتا ہے، ویسے ہی میں نے اپنے ضمیر اور شعور میں چبھی ہوئی پھانسوں کو قلم کی نوک سے نکالا ہے اور ورق پر رکھ دیا ہے۔ اب اگر یہ آپ کو چبھنے لگیں تو اس میں میرا کوئی دوش نہیں۔

میرے بڑوں اور میرے دوستوں نے میری کہانیوں کے بارے میں جو اچھی اچھی باتیں کی ہیں، یہ دراصل ان کی محبتیں ہیں اور محبت تو سدا کی اندھی ہے۔ مجھے بڑوں کی عنایت اور دوستوں کی محبت سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے تھا لیکن کیا کروں یہ کمینگی کر ہی گزری ہوں۔

کہانیاں جب کاتی جاتی ہیں تو اُن کا سوت لکھنے والے کے پس منظر سے فراہم ہوتا ہے۔ میری کہانیوں کے سوت کا اگر حساب لگایا جائے تو وہ کچھ یوں ہے کہ قدیم مگدھ اور جدید بہار کا تاریخی شہر سہسرام میری جنم بھومی ہے اور ۵، اکتوبر ۱۹۴۶ء تاریخ اور سن پیدائش۔ میرے وجود کی ترکیب میں مغل، عرب اور پٹھان عناصر شامل ہیں۔ دنیا کے تمام خاندانوں کی طرح میری خاندانی داستان بھی ہجرت سے عبارت ہے۔ ان ہجرتوں کے درمیان ہم نے منصفی اور سپہ گری کی، شعر کہے، کتابیں لکھیں، کبھی دربار میں بٹھائے گئے، کبھی بازاروں میں پھرائے گئے۔ اُنیسویں صدی میں ہم نے بغاوتوں کا سرنامہ لکھا اور بیسویں صدی کے آغاز میں ہم میں سے کچھ برٹش راج کے ستون بنے۔ غرض ہم میں سے کچھ قاتلوں کی صف میں کھڑے ہوئے، کچھ مظلوم ٹھہرے اور دار و رسن کی آزمائش سے گزرے۔

۱۸۵۷ء میں ہمارے خاندان نے حسبِ حیثیت اپنے خون کا نذرانہ دیا۔ میرے ایک پُرکھ مرزا دلدار بیگ (المعروف بہ خاکی شاہ) دریائے جہلم کے کنارے اُس پیڑ کے سائے میں سوتے ہیں جس پر فرنگی نے انھیں پھانسی دی تھی۔ ہم میں سے کوئی راجہ کنور سنگھ کے بھائی بھتیجوں کے ساتھ توپ دم ہوا اور کوئی فرنگی کی فوج سے لڑتے ہوئے جنگلوں میں مفقود الخبر ہوا۔ ایک بزرگ مرزا عبدالستار بیگ سہسرامی اس ہنگامۂ دار و گیر کے بعد گوشہ نشیں ہوئے، پندرہ سو صفحات اور تین جلدوں پر مشتمل تذکرۂ صوفیاء "سالک السالکین فی تذکرۃ الواصلین" لکھی۔ میرے والد محمد ابوالخیر کو بغاوت اور شورش کے جرم میں چودہ سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ انھوں نے کچھ دن جیل میں کاٹے پھر خاندانی اثر و رسوخ کے سبب وقت سے پہلے رہا ہوئے۔ ایک زمانے میں انھوں نے ویدانت کے فلسفے سے متاثر ہو کر دنیا ترک کی اور جنگل کی راہ لی لیکن ترک و تیاگ شاید ان کے بس کی بات نہ تھی اس لیے واپس آ گئے۔ اس کے بعد نیتاجی کی فوج میں شریک ہونے کا ارادہ کر کے نکلے لیکن ایک عشقِ بلاخیز میں گرفتاری کے سبب رنگون نہ جا سکے۔ وہ ایک آدرش وادی انسان تھے اسی لیے تاحیات پریشانیوں میں گرفتار رہے۔ ان کی زندگی کے آخری دن شدید جسمانی اور روحانی عذاب میں گذرے۔

تو یوں ہے کہ میں ایک خوشحال گھرانے کے پریشاں روزگار بیٹے، بے آرام باغی اور ناکام آئیڈیلسٹ کی بیٹی ہوں۔ بغاوت اور انحراف میری نہاد و بنیاد میں ہے۔ ابتدا سے اب تک زندگی روشِ عام سے ہٹ کر گذری ہے۔ لڑکیاں جس عمر میں گڑیاں کھیلتی ہیں میں اس عمر میں اردو اور فارسی کا کلاسیکی ادب پڑھ رہی تھی۔ میرے گرو، میرے اُستاد، مجھے بنانے والے، مجھے بگاڑنے والے میرے باپ تھے۔ شعر و ادب کا اور تاریخ و تہذیب کا جتنا بھی مجھے شعور ہے، وہ اُنھی کی عطا ہے۔ انھوں نے "مہابھارت"، "جوگ بشسٹ" اور "شاہنامۂ فردوسی" کے قصے سنا کر مجھے زندگی کرنا سکھایا۔ شاہنامے نے مجھے اپنے سحر میں اس طرح اسیر کیا کہ اُس سے رہائی شاید عمر بھر نہ ہو۔ رودابہ، گردآفرید، تہمینہ اور منیژہ میرے گھٹے میں اتر گئیں۔ سامی روایات کے مطابق آدم و حوا کے قصے میں حوا کا فعّال اور باغی کردار، اور شاہنامے میں منیژہ کا "برائے یکے بیژنِ شور بخت" زمین و آسمان ایک کرنا۔ ان دو معاملات نے میرے مزاج کی تعمیر میں نہایت بنیادی کردار ادا کیا۔

داستانوں اور افسانوی کرداروں کے علاوہ میری زندگی میں شہر بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ میں نے اپنے روحانی معاملات کا تعین شہروں

سے کیا ہے۔ جہلم، سہسرام، کراچی، دلّی، امروہہ۔ ہر شہر سے ایک گہرا رشتہ ہے۔ ہر رشتے کی جدا جہتیں ہیں اور انھی جہتوں میں سے ایک جون ایلیا ہیں۔ ان سے ذہنی رفاقت کا تیرہ برس پرانا رشتہ ہے۔ میں نے ذہنی رفاقت کے اس سفر میں بہت کچھ سیکھا ہے، بہت کچھ کھویا ہے، بہت کچھ پایا ہے۔

چیزیں جو کھو گئی ہیں، اُن کا دل کو ملال نہیں اور جو چیزیں پائی ہیں اُن کا بارِ احسان اٹھائے نہیں اٹھتا۔ بے اطمینانی اگر ہے تو صرف اس بات کی کہ وقت بہت کم ہے، کام بہت باقی ہے اور میں بہت احدی ہوں۔

بچپن میں بھوتوں، پریتوں، چڑیلوں اور بھِل پائیوں سے ڈرتی تھی۔ بڑی ہوئی تو بے خوفی اس حد کو پہنچی کہ خداوندوں کا خوف بھی دل سے جاتا رہا۔ اب صرف وقت سے خوفزدہ ہوں جو ہاتھ میں ترازو لیے بیٹھا ہے اور کسی کے ساتھ بھی رو رعایت نہیں کرتا۔ وہ نہ دوست ہے، نہ دشمن۔ وہ کھوٹے کو کھرا اور چاندی کو سونا قرار نہیں دیتا۔ میں اس سے پناہ چاہتی ہوں اور اسی کی امان میں آتی ہوں۔

زاہدہ حنا

۵، مارچ ۸۳ء

ناکُجا آباد

جاتی ہوئی دھوپ ستونوں سے لپٹ کر دھیرے دھیرے یوں اُتر رہی ہے
جیسے کوئی آہستہ آہستہ تہ خانے کی سیڑھیاں اُترتا ہے۔ محرابوں میں جہاں کچھ دیر پہلے
دھوپ کی چادر تنی ہوئی تھی اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے، محرابیں میری بانہوں کی مانند
خالی اور ویران ہیں۔ جامن اور پیپل کے زرد پتے ہوا کے بگولوں کے ساتھ ان محرابوں
میں ایک لمحے کے لیے اپنا چہرہ دکھاتے ہیں پھر تھک ہار کر زمین پر گر جاتے ہیں۔
میں چبوترے سے ٹیک لگائے کھڑی ہوں اور ان ستونوں اور محرابوں کو دیکھتی ہوں،
ان کا سُونا پن اور اداسی مجھے یاد دلاتی ہے کہ یہ جگہ میرے گھر سے کس قدر مشابہ ہے۔
اپنی تعمیر میں نہیں، اپنی تنہائی اور ویرانی میں۔

ابھی کچھ دیر بعد جب دھوپ ستونوں سے اُتر کر خاک میں مل جائے گی تو ملازم
شور مچاتے ہوئے کچھ چیزیں گراتے اور کچھ چیزیں سنبھالتے ہوئے آئیں گے۔ کرسیاں
گھسیٹ کر نیم ہلالی انداز میں رکھی جائیں گی پھر سفید میز پوشوں سے سجی ہوئی میزیں ان
کرسیوں کے سامنے نہایت سلیقے سے لگا دی جائیں گی۔ اس کے بعد آوازوں کا، قدموں
کی چاپ کا، بچوں کی ہنسی اور بوڑھوں کی بڑبڑاہٹ کا ایک ملا جُلا شور بلند ہوگا اور سب لوگ

اپنی اپنی جگہیں سنبھال لیں گے۔ ملازم ایک مرتبہ پھر آئیں گے۔ اس مرتبہ وہ دبے پاؤں آئیں گے، ان میں سے ہر ایک کے ہاتھوں میں اسٹین لس اسٹیل کی چمکتی ہوئی ٹرے ہوگی جس میں چائے کے برتن کھنک رہے ہوں گے اور اشتہا انگیز چیزوں کی خوشبو ہیور سیلون ٹی کی میٹھی مہک میں گھل مل جائے گی۔ بچے پلیٹوں میں رکھی ہوئی چیزوں پر ٹوٹ پڑیں گے، بڑے انھیں سلیقے سے کھانے کی ہدایت کریں گے اور بوڑھے کھانس کر اپنے وجود کا احساس دلائیں گے۔ پھر یہ سب لوگ باتیں کرنے لگیں گے۔ حال کی باتیں، مستقبل کی باتیں، اگلی فیکٹری کا منصوبہ، آئندہ ہفتے خریدے جانے والے پلاٹ کا ذکر، ان لائسنسوں کا تذکرہ جن کے وہ خواب دیکھتے ہیں اور جن کے حصول کی خاطر وہ اپنا آپ بیچ سکتے ہیں۔ بچے نئے کامکس خریدنے کی فرمائش کریں گے اور بیویاں جو دو منزلہ اپارٹمنٹس میں علیحدہ علیحدہ رہتے ہوئے بھی جوائنٹ فیملی سسٹم کے مزے اٹھاتی ہیں، روزانہ کی طرح آج بھی ان جدید ترین اپارٹمنٹس کی پشت پر بنے ہوئے پرانے وضع کے چبوترے پر اُس بوڑھے کے ساتھ چائے پییں گی جو سب سے نمایاں مقام پر بیٹھ کر جانے کیا سوچتا ہے۔ سنجیدہ چہروں والے یہ مرد جو آپس میں بھائی ہیں اور یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ کاروبار بڑھانے اور پھیلانے کے لیے پبلک ریلیشننگ اور دنیاداری کس قدر ضروری ہے، وہ ایک دوسرے سے نفرت کرنے کے باوجود اچھی اچھی باتیں کریں گے اور ان میں سے کسی کو بھی ماضی یاد نہیں آئے گا کیونکہ ان کے لیے ماضی بہت دور رہ گیا ہے۔

وہ بوڑھا چائے پیتے پیتے ان سب کے کھوکھلے چہروں کو دیکھے گا اور پھر نگاہیں جھکا لے گا، یہ سب لوگ جو اس کا اپنا خون ہیں، ان کے چہروں پر خوشامد کی گرد ہے۔ یہ اُس سے اور اُس کے شاندار ماضی سے کٹے ہوئے لوگ ہیں، کٹی ہوئی پتنگیں۔ وہ انھیں حقارت سے دیکھے گا اور اُس کی موم لگی مونچھوں میں غصے کی تھرتھراہٹ دوڑ جائے گی، پھر وہ خاموشی سے مجھے دیکھے گا اور مجھ میں اپنا چہرہ ڈھونڈے گا، اپنا چہرہ اور اس کے علاوہ

دوسرے بہت سے چہرے، بہت سی یادیں، بہت سی باتیں۔

جب ان ستونوں اور محرابوں پر، دروں اور دیواروں پر میری نظر پڑتی ہے تو مجھے اپنا گھر یاد آتا ہے، وہ گھر جو مجھ سے زیادہ یہاں باتیں کرنے والوں کا گھر تھا لیکن جسے اس بوڑھے کے سوا سب بھول چکے ہیں۔ یہ باتیں اگر میں باآوازِ بلند سوچنے لگوں تو یہ لوگ قہقہے مار کر ہنسیں گے اور مجھ سے پوچھیں گے کہ کس گھر کی باتیں کرتی ہو؟ تمھارا گھر تو یہ ہے جس کے چبوترے سے ٹیک لگائے تم کھڑی ہو، اس کے سوا تمھارا گھر بھلا کہاں ہے؟ اور ان لوگوں کو ہنسنا ہی چاہیے کیونکہ انھیں نہیں معلوم کہ گھر اینٹوں سے بنی ہوئی چار دیواری، چھت اور کمروں کا نام نہیں، گھر تو وہ جگہ ہے جو ہمارے اندر بسی ہوئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ایسی جگہ میرا گھر ہو جہاں میں نے آنکھ نہ کھولی ہو، زندگی نہ گزاری ہو بلکہ جسے میں نے دیکھا تک نہ ہو۔ اس سے میرا روح کا رشتہ ہو، بالکل ایسے ہی جیسے بہت سے لوگوں کا روح کا رشتہ مقدس مقامات اور مزاروں سے استوار ہوتا ہے۔ ان میں سے بیشتر لوگ ایسے ہوتے ہیں جنھوں نے کبھی ان جگہوں کو دیکھا نہیں ہوتا، اُن مزاروں کی خاک اپنے چہرے پر نہیں مَلی ہوتی لیکن وہ جگہیں ان کا گھر ہوتی ہیں۔ ایسے گھر جن میں اُن کی روح آباد ہو۔

میں سوچتی ہوں کہ وہ گھر اب کس حال میں ہوگا جس کی روشن پرچھائیں میرے وجود پر اپنا سایہ ڈالتی ہے۔ شاید اس کی چھتیں گر گئی ہوں اور دیواریں ڈھ گئی ہوں، اس کے آنگن میں اور کیاریوں میں خودرَو پودے اور گھاس اُگ آئی ہو اور اس گھاس میں سانپ اور بچھو سرسراتے ہوں اور اس کے در و دیوار پر گزرے ہوئے وقت کے بھوت ناچتے ہوں۔ لیکن وہ برباد اور ویران گھر میرے دل میں کس کس طرح آباد ہے، اُس کے وجود سے خوشبو کی کیسی لپٹیں اٹھتی ہیں، دھرتی کی مہک، مٹی کی خوشبو۔

مٹی کی خوشبو پر مجھے وہ قبریں یاد آئیں جو بہت سی برساتوں کے بعد دھنس گئی ہوں گی، جن پر اب نہ چراغ جلتا ہے، نہ اگر کی خوشبو پھیلتی ہے اور نہ ان کے سرہانے بیٹھ کر دھیمی آواز

سے کوئی رونے والا رہا ہے۔ ان قبروں کو چھُونے والی بادِ شمال مجھے آواز دیتی ہے، مشرق میں پھیلے ہوئے سرمئی پہاڑوں کے سلسلے میری طرف بانہیں پھیلاتے ہیں اور چند تن شہید پیر مجھے اپنے قدموں میں بلاتے ہیں۔ آج بھی شام جب اُن پہاڑوں کے دامن میں پھیلتی ہے تو شیر اپنی کچھاروں سے نکلتے ہیں اور ان قبروں کے سامنے قلعے کے پہریداروں کی طرح بیٹھ جاتے ہیں، پھر رات کی تاریکی میں اُن کی انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھیں ان شہید مردوں کے مزار پر چراغ کی طرح روشن رہتی ہیں۔ یہ آنکھیں میرا انتظار کرتی ہیں۔ حسن خان کی باؤلی اور آدم خاں کی املی اور شیر شاہ کے تالاب کی منڈیروں پر میرے نام کے دیوے جلتے ہیں۔ اللہ اللہ میں اپنے وجود پر کس قدر مُصر ہوں، وہی انا کی جنگ، لب و لہجے کا وہی طمطراق۔ لاموجود الا اللہ جب خدا کو اپنے وجود پر اتنا اصرار ہے تو پھر یہ اصرار مجھے کیوں نہ ہو کہ میں تو حواس کے تمام دائروں پر محیط ہوں۔

گھر ویران، قبریں تنہا اور ان میں سونے والے بے آرام۔ یہ سب کچھ صرف اس لیے ہوا کہ دلیر زاد اجداد نے بونے جانشینوں کو جنم دیا اور ان بونے جانشینوں کی اولاد وہ لوگ ہیں جو یہاں ہر شام شور مچاتے ہیں اور محض بے کار باتیں کرتے ہیں، یہ سب کتنے خوش اور کس قدر آباد ہیں۔ میں یہاں ان سب لوگوں کی موجودگی کے باوجود تنہا ہوں، صرف ایک لمس ایسا ہے جو میرے سر اور پُشت پر سرسراتا ہے تو میرا احساسِ تنہائی چند ساعتوں کے لیے معدوم ہو جاتا ہے۔ یہ بوڑھا لمس اُس شام کتنا جوان تھا جب اُس نے مجھے میرے کُل سے جُدا کیا تھا اور میں اس کی جدائی کا نوحہ نہ پڑھ سکی تھی، ماتم نہ کر سکی تھی کہ میں گلاب کی ایک شاخ تھی، ایک ایسی شاخ جو آج کے بوڑھے اور کل کے جوان کو اس لیے بہت عزیز تھی کہ میں گلاب کے جس پودے کا حصّہ تھی اُسے اس کے باپ نے بہت محبّت سے اپنے گھر کے آنگن میں لگایا تھا۔

محبّتوں کا یہ سلسلہ بہت دراز تھا۔ اس آنگن کے ہر درخت اور پودے سے رفتگاں کی یاد وابستہ تھی۔ جامن کا پیڑ دادا نے لگایا تھا، جو ہی پھوپھی اماں کے ہاتھوں کھلی تھی، اور دد

باداجان کا لگایا ہوا تھا اور ہار سنگھار دادی مرحومہ کی یادگار تھا۔ ہر یاد سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہی تھی اور خاندانی ورثے کے طور پر اگلی نسلوں کو دی جا رہی تھی۔ بالکل اُسی طرح جس طرح آدم نے اپنی روایت شیث کو سونپی اور شیث نے انوش کو، انوش نے قینان کو اور قینان نے محللئیل کو، محللئیل نے یارد کو، یارد نے حنوک کو اور حنوک نے متوشالح کو اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا، چلتا رہا پھر میرے آنگن کے بزرگ تک پہنچا۔

میں اپنے آس پاس کھڑے جامن اور پیپل کے پیڑوں کو دیکھتی ہوں اور حیران ہوتی ہوں۔ نہ جانے یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ انھیں اس زمین میں کس نے لگایا تھا اور ان کی جڑیں زمین میں جانے کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ پیڑ ان لوگوں کی باقیات ہیں جو آج یہاں نہیں ہیں اور جانے کہاں ہیں۔ یہ بھی ان انسانوں کی طرح ہیں جن کا حسب نسب وقت کی اکھاڑ پچھاڑ میں گم ہو چکا ہے اور اب یہ بے حیثیت اور گمنام ہیں۔ میں بھی انہی کی طرح بے حیثیت ہوں۔ میرا شجرۂ نسب تو اسی آنگن میں رہ گیا جس میں میری جڑیں تھیں۔ اپنے سر اور پُشت پر تھرتھراتے ہوئے لمس سے کبھی کبھی مجھے نفرت ہونے لگتی ہے۔ اسی لمس نے مجھے گھر سے بے گھر کیا، مجھے میرے قدموں کی گیلی مٹی سے دور کیا۔ یہ سب چیزیں اس وقت جب کہ موجود تھیں کتنی معمولی اور غیر اہم تھیں لیکن اب جب کہ یہ کہیں نہیں ہیں کتنی اہم ہو گئی ہیں۔

اہم اور غیر اہم باتیں، کتنی بہت سی یادیں، کتنے بہت سے لمحے جو میرے وجود میں زہرِ قاتل کی طرح سرایت کر چکے ہیں آن کی آن چہرہ دکھاتے ہیں اور پھر وحشی ہرن کی طرح یاد کے جنگل میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ تب بہت سی آوازیں شکاری کُتّوں کی طرح میرا تعاقب کرتی ہیں، میں اُن کے قدموں کی چاپ سُن کر بھاگتی ہوں اور بھاگتی چلی جاتی ہوں، پھر میرا سانس اکھڑنے لگتا ہے، میں زمین پر گر جاتی ہوں اور یہ آوازیں چاروں طرف سے مجھے گھیر لیتی ہیں۔ یہ ابھی اپنے نوکیلے دانتوں سے میری گردن اُدھیڑ دیں گی، میری پنڈلیاں چاب جائیں گی اور

پھر ۔۔۔۔ پھر دوسرے دن بھی یہی کھیل دہرایا جائے گا اور تیسرے دن بھی۔

یاد کی دھند میں لپٹی ہوئی سہ پہر کے سائے پھیل رہے ہیں۔ بڑے دالان میں لڑکیاں تخت پر آبِ رواں کے دوپٹے پھیلائے بیٹھی ہیں۔ مٹی کی غلچیوں میں گلابی، نیلے، سُرخ اور سبز رنگ گھُلے ہوئے ہیں۔ گوند کے سُغوف نے انھیں گاڑھا کر دیا ہے۔ بجّو بن بہو نے رنگ کی ان غلچیوں میں پرانے اور دبیز کپڑوں کو تہ کر کے بھگو دیا ہے۔ اب لکڑی کے خوبصورت بھاگل پوری ٹھپّے جن پر طرح طرح کے بیل بوٹوں کے نقوش اُبھرے ہوئے ہیں، رنگ میں بھیگے ہوئے ان دبیز کپڑوں پر پھیر کر تر کیے جائیں گے اور دوپٹے چھاپے جائیں گے۔ بجّو بن بہو بی بی کی ساڑیاں لیے بیٹھی ہیں۔ ایک ساڑھی لہریا۔ نگی جائے گی اور دوسری تلنگا رنگ، وہ لہریا رنگ کے لیے سُوت کی ڈوریوں کو مروڑی دے رہی ہیں۔ لڑکیوں کے ہاتھ تیزی سے چل رہے ہیں۔ شام سر پہ کھڑی ہے، کوئی لمحہ جاتا ہے کہ منا کو بوا اپنا جھم جھماتا پرات سر پہ دھرے، مانگ میں سیندور، ماتھے پر بڑی سی بندیا سجائے، اُلٹا آنچل اوڑھے، کڑے بجاتی، ہاتھی دانت کے چُوڑے اور چاندی کی چوڑیاں چمکاتی آپہنچیں گی، رام رام کرتے ہوئے پرات سر سے اتار کر دالان کی دہلیز پر رکھیں گی پھر بی بی کو ہاتھ جوڑ کر بندگی کریں گی اور ''گوڑ لگے ہیں بی بی'' کہہ کر زمین پر بیٹھ جائیں گی۔ پرات پر سے ململ کا دوپٹا ہٹائیں گی تو گرما گرم سنبوسے، پیاؤ، اندرسے، ٹِلکُٹ، چنے کے چٹ پٹے، منگریلا پڑے نمک پارے اور املی کے پنّے کی خوشبو سے سارا دالان مہک جائے گا۔ ''بھئی جلدی کرو، میاں بس اب اٹھنے والے ہیں''، ایک لڑکی نے دوسری لڑکیوں سے کہا ہے۔ ''تنی لڑکن لوگ جلدی کرا، تو لوگن کا تو نگوڑا ہاتھن نہیں چلتا''۔ بجّو بن بہو ناراض ہوتی ہیں۔

جلدی کرو، پردہ گراؤ، وقت کا رہوار ان سب کو اپنے قدموں تلے، روندتا گزر رہا ہے۔

زندگی، موت، اُجالا اور اندھیرا اور پھر اُجالا۔ طاقوں میں رکھے دیے جلاؤ۔

شام ڈھل چکی، ماماؤں نے بیلے کے کھلتے ہوئے پھول سرخ اِک رنگے میں لپیٹ کر

گھڑوں کے سرپوشوں پر دھرے اور چھڑکاؤ کیے ہوئے آنگن میں پلنگڑیاں گھسیٹ کر ایک طرف سلیقے سے لگادیں۔ ان پلنگڑیوں پر خوبصورت بیل بوٹوں والے سوتی غالیچے بچھے ہوئے ہیں جو میاں پچھلے برس مونگیر سے لائے تھے۔ دوسری طرف چوکوں کا تخت لگا ہے جس پر چاندنی کھنچی ہے اور چاندنی پر طبلے کی طرح کسے ہوئے گاؤ تکیے رکھے ہیں۔ تخت کے ساتھ پیچوان دھرا ہے، عظیم آبادی تمباکو کی خوشبو ہر طرف پھیل رہی ہے۔ ابھی میاں مغرب کی نماز پڑھ کر بڑے دَر سے کھنکارتے ہوئے نکلیں گے اور اپنا دوشالہ سنبھالتے ہوئے تخت پر آ بیٹھیں گے، پیچوان کی نے ہاتھ میں تھام کر بھرے بھرے ہونٹوں تک لے جائیں گے پھر تمباکو کی خوشبو اور آنگن میں پرا جمائے پودوں پر کھلتے ہوئے پھولوں کی مہک میں گم ہو جائیں گے۔

بھادوں کا مہینا ہے، بی بی حضرت خواجہ خضر کا روزہ کھول کر، بڑی بڑی روٹیوں پر بھورا کتھا، ڈلی اور پان رکھ کر اور نیاز دے کر باہر پلنگڑی پر آ بیٹھیں گی، ڈلی کتریں گی اور نئے بالوں کی ڈھولی کو الٹ پلٹ کر دیکھیں گی۔ ان کی آبِ رواں کی ساڑی میں لگی ہوئی ابرک جھلملائے گی۔ بالیوں میں گندھے ہوئے بیلے کے پھول سر کی جنبش کے ساتھ جھولتے رہیں گے اور وہ بیڑا لگاتے ہوئے ہلکے سُروں میں گنگنائیں گی۔

الاہ تیری گلیوں میں برسے نور، بیلا بھی بویا، چمیلی بھی ارئی۔ الاہ میں نے بوئے ہزار دل پھول، بیلا بھی پہنا، چمیلی بھی پہنی۔ الاہ تیری گلیوں میں برسے نور۔

دالان سے پرے، دہلیز سے پرے، صدر دروازے سے پرے۔ سیتا کنڈ پر، حسن خاں کی باؤلی پر، بڑے امام باڑے پر، شیر شاہ کے روضے پر، کیمور کی پہاڑیوں پر، بدری نرائن پر اور چندن شہید پیر کے مزار پر الاہ کا نور برستا رہے گا۔

باورچی خانے میں بھولو بھومٹی کی کوری سکوریوں میں غازی میاں کی انکھیاں جما رہی ہیں۔ آٹے کی آنکھ بنی ہے، چینی اور دودھ میں پکائی گئی ہے، رات کے کھانے سے پہلے مولوی صاحب مردانے سے بلائے جائیں گے اور وہ مسعود سالار غازی کی نیاز

دیں گے۔ سکوریوں میں جمی ہوئی، چینی اور دودھ میں پکی ہوئی آنکھیں راہ دیکھیں گی، جانے والوں کی راہ، کبھی نہ آنے والوں کی راہ۔

اور بڑکھارٹ گلی میں میونسپلٹی کی لالٹین ہلدی ایسی پیلی روشنی پھیلا رہی ہے۔ یہ روشنی چند گز کے بعد اندھیرے میں گم ہو جاتی ہے۔ گلی سے کوئی پالکی گزر رہی ہے۔ کہاروں کے ننگے پیروں کی چاپ پر اُن کی آواز غالب ہے، ہانپتی ہوئی، ٹوٹتی ہوئی آواز۔ اونچا نیچا دیکھ کے، بی بی کی سواری آئی، اونچا کھالا دیکھ کے، اونچا نیچا دیکھ کے۔

کہاروں کی آواز دور چلی جاتی ہے اور گلی تومڑی کی آواز سے بھر جاتی ہے۔ یہ آواز گلی والوں کی یاد دلاتی ہے کہ آج بدھ، سولہوں سُدھ ہے۔ آج کی رات باؤل شاہ کی رات ہے۔ باؤل شاہ کی ملال انگیز اور پاٹ دار آواز صدیوں پرانے گھروں کی دیوارں، دروں، کھمبوں اور ڈاٹوں پر سر پٹکنے لگتی ہے۔ لکھ لکھ بیتیا کے بھیجن کنور سنگھ — اے سُن امر سنگھ بھائی، ہو رام۔ چمڑا کے ٹٹرو دانت سے ہو کاٹے، کہ چھتری کا دھرم نسائے ہو رام۔ بیتیا کے کارن سے بابو کنور سنگھ، فرنگی سے ہو ریڑھ بڑھائے ہو رام۔

مرزا عبدالستار بیگ بادامی کاغذ پر خواجۂ خواجگان، سلطان الہند معین الدین چشتی کے باب میں لکھتے لکھتے رک گئے ہیں، باؤل شاہ کی آواز کا خنجر اُن کے سینے میں ہمیشہ کی طرح اُتر گیا ہے۔ وہ جرمن شیشے کی چمنی والے دو بتی لیمپ کی لَو کو دیکھتے ہیں۔ اس کی دونوں بتیوں کی لَو پر انہیں اپنے باپ کا چہرہ مسکراتا ہوا نظر آتا ہے، پھر وہ چہرہ لہریں لینے لگتا ہے اور دریائے جہلم کے کنارے اس پیڑ کی ڈالیوں پر پھول کی طرح کھلنے لگتا ہے جس پر اس چہرے کے توانا بدن اور باغی روح نے زندگی کی آخری سانس لی تھی۔

مرزا عبدالستار بیگ کی آنکھیں پُر آب ہو جاتی ہیں۔ جہلم کی سوندھی مٹی بہت دور ہے۔ پیپل کا وہ پیڑ بہت دور ہے جس پر اُن کے باپ نے سُولی پائی تھی اور جس کے سائے میں سہسرام کی مٹی سے کاڑھا ہوا وہ شہید خون سوتا ہے۔ مرزا دلدار بیگ عرف

خاکی شاہ۔ خاکی لباس پہننے والے اور خاک میں ملنے والے کو اگر بہسلم کے پھر بھادل بخش نے پیپل کے ہرے بھرے پیڑ کی ڈالی سے اتار کر سپرد خاک کیا اور پھر خاکی شاہ کے نام سے یاد کیا، تو کیا غلط کیا۔

مرزا عبدالستار بیگ ولد مرزا دلدار بیگ۔ شہید باپ کا صوفی منش بیٹا۔ بادامی کاغذ پر نیلی روشنائی سے لکھے ہوئے اپنے حروف کو دیکھتا ہے، پچھوا چل رہی ہے۔ ریت گھڑی کے نیچے دبے ہوئے کاغذ پچھوا کے چلنے سے پھڑپھڑاتے ہیں۔ جرمن لیمپ کی لویں بھڑکتی ہیں۔ مسالک السالکین فی تذکرۃ الواصلین۔ سلوک اور تصوف کی منزلیں، وصل اور فراق کے درجے۔ شہید باپ کے صوفی مزاج بیٹے نے اپنی اس کتاب میں سب چیزیں سمیٹ لی ہیں۔

باؤل شاہ کی آواز بہت دور چلی گئی ہے اور سمٹ کر آواز کا نقطہ بن گئی ہے۔ جگدیش پور کی طرف سے آتی ہوئی ہوائیں کنور سنگھ، امر سنگھ اور رنشان سنگھ کے خون کی خوشبو سے بھیگی ہوئی ہیں۔ یہ اُن راجپوتوں کے خون کی خوشبو ہے جو لال قلعے کی طرف بیر کر کے نہیں سوتے تھے اور جو اپنے بادشاہ کے لیے کمپنی بہادر کی فوجوں سے لڑ مرے تھے۔

کچھ دور پر تھانے میں فرنگی راج کے نائبین اپنی مونچھوں کو بل دے رہے ہیں اور باؤل شاہ کی آواز کا ڈنک اپنی سماعتوں میں اُترنے نہیں دیتے۔

دائرہ کے سجادہ نشین کا ہاتھ کانپ جاتا ہے۔ لوہے کی کھلی ہوئی صندوقچی اشرفیوں سے بھری ہوئی ہے اور ان کی گداز انگلیاں اُن اشرفیوں کے اُبھرواں حصوں کو چھو رہی ہیں۔

وہ باؤل شاہ کی دور جاتی ہوئی آواز سن کر حقارت سے سر کو جھٹکتے ہیں۔ سہسرام میں کاسٹلے صاحب کی نیل فیکٹری جب باغیوں نے لوٹی تو انھوں نے باغیوں کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن ان موذیوں کے آگے اُن کی ایک نہیں چلی تھی۔ پھر اُنھی کی کوششوں سے شہر کو باغیوں سے پاک کیا گیا۔ سہسرام کے مجسٹریٹ بیکر صاحب اور آرہ کے ویک صاحب نے انھیں دربار سے سند وفاداری دلوائی۔ "حضرت" کا خطاب عطا ہوا، وہ

سہسرام میں سرکارِ انگلیشیہ کے دستِ راست ہیں۔ کنور سنگھ اور اس جیسے دوسرے تمام نابکار کیفرِ کردار کو پہنچائے جا چکے ہیں۔ ملکہ ٹوریہ کے راج میں اب ہر طرف چین ہی چین ہے اور ایک یہ باؤل شاہ ہے کہ ابھی تک کنور سنگھ، امر سنگھ اڑائے جاتا ہے۔ ملکہ ٹوریہ کے چہرے والی اشرفیاں ان کی انگلیوں سے پھسل کر آہنی صندوقچی میں گر رہی ہیں۔ مرزا عبدالستار بیگ کی ریت گھڑی میں ریت پھسل رہی ہے گر رہی ہے، وقت گزر رہا ہے۔

مرزا صاحب ریت گھڑی کی طرف دیکھتے ہیں، وقت بہت گزر گیا۔ کام ابھی بہت باقی ہے۔ وہ سنبھل کر خواجۂ خواجگان، سلطان الہند معین الدین چشتی اجمیری کے باب میں ایک جملہ لکھتے ہیں۔ "راہِ محبت وہ راہ ہے کہ جو کوئی عشق دوست میں اس راہ پر آیا بے نام و نشاں ہوا۔"

وہ رک کر اپنے لکھے ہوئے اس جملے کو دوبارہ پڑھتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ سلوک کی منزلیں عشق حقیقی میں مبتلا صوفیوں کے علاوہ عشق بشر میں گرفتار عارفوں نے بھی طے کی ہیں۔

وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ جب اُن کے باپ اور اُن جیسے دوسرے ان گنت ہندوستانیوں کو پھانسیاں لگ رہی تھیں، عین اُسی زمانے میں ہندوستان سے ہزاروں میل دور، لندن کے ایک تنگ و تاریک فلیٹ میں رہنے والا ایک جرمن، ہندوستان کے بارے میں اور ہندوستانی جنگ آزادی کے بارے میں مراسلوں پر مراسلے لکھ رہا تھا اور اس کے لکھے ہوئے مراسلے "نیویارک ڈیلی ٹربیون" میں چھپ رہے تھے۔

یہ وہ عارف تھا کہ جس کی شطحیات کچلے ہوئے مظلوم انسانوں کو حیاتِ نو کی نوید دینے والی تھیں۔ یہ وہ تھا کہ جو مراتبِ طریق کے پانچوں مرحلوں علم، عمل، نیت، صدق اور عشق سے سربلند و سُرخرو گزرا تھا۔ یہ وہ تھا جس کے بارے میں ایک کشمیری نژاد برہمن زادہ بے ساختہ کہنے والا تھا "آں کلیمؑ بے تجلّی آں مسیحؑ بے صلیب"

عشقِ بشر کی انتہاؤں کو پہنچنے والے اس جرمن نے اپنے ایک مراسلے میں جہلم کی اُس

بغاوت کے بارے میں لکھا تھا جس کے نتیجے میں مرزا دلدار بیگ اور ان کے ساتھیوں نے پھانسی پائی۔ ایک دوسرے مراسلے میں اُن کے پرکھوں کے علاقے پٹنہ، آرہ اور شاہ آباد کی بغاوتوں کی تفصیلات لکھی تھیں۔ راجا کنور سنگھ اور راجا امر سنگھ کے حملوں کا ذکر کیا تھا۔

مرزا عبدالستار بیگ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ جرمن ایک یارِ وفادار بھی رکھتا ہے اور اسی یارِ وفادار نے جس کا نام فریڈرک اینگلز تھا "نیویارک ڈیلی ٹریبیون" میں لکھا تھا کہ جگدیش پور کے جنگل باغیوں کی آماجگاہ ہیں اور ان کی کمان امر سنگھ کے ہاتھ میں ہے جس نے گوریلا جنگ کی تکنیک سے بہتر واقفیت اور عملی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔

اُس یارِ وفادار نے جب یہ جملہ لکھا تھا، اس وقت وہ بھی ہوچی منہ اور چی گویرا کے نام سے واقف نہ تھا جنھیں اس کے بعد ہونا تھا اور جن کا شمار گوریلا جنگ کے ماہرین میں ہونے والا تھا۔

انسان کس قدر کم جانتا ہے۔ اپنے زمانے کے بارے میں، اپنے بعد آنے والے زمانے کے بارے میں۔ انسان بچوں کی طرح ہے، اُنھی کی طرح ناواقف، اُنھی کی طرح لاعلم۔

نچلے آنگن میں بچے جمع ہیں اور کھیل رہے ہیں۔ اُن کی آواز مرزا صاحب تک آ رہی ہے۔ آلوگالو ماموں چور، باگھ جیسے بگولا جیسے، ساون ماس کریلا پھولے، پھول پھول کی بالیاں، با دا گئے گنگا، لائے سات پیالیاں، ایک پیالی پھوٹ گئی، نیولے کی ٹانگ ٹوٹ گئی، کھنڈا ماروں یا چھری؟

بہت سے بچوں کی ملی جلی آوازیں بلند ہوتی ہیں "کھنڈا"۔

اور پھر پہلی آواز چیخ کر کہتی ہے۔ "تیری ماں کا پیٹ ٹھنڈا"۔

اس کے ساتھ ہی بہت سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز ہے اور ساتھ ہی اُن کے گلوں سے پھوٹتے ہوئے قہقہوں کے جھرنے ہیں جو مختلف دردں میں گم ہوجاتے ہیں۔

رات کو کھانے سے فراغت کے بعد بھی بچے اپنی بوا کو گھیر کر بیٹھیں گے اور شہزادہ

فرخندہ بخت کی کہانی سنانے کی فرمائش کریں گے، بُوا اپنی پن کٹی میں پان کوٹتے ہوئے انہیں ٹالیں گی لیکن بچے ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ پھر بُوا کی بوڑھی اور پوپلی آواز آنگن کے اُس گوشے کو بھر دے گی۔

سوتا سب سنسار، جاگتا پاک پروردگار، ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، کانوں سُنی کہتے ہیں، آنکھوں دیکھی نہیں کہتے۔ اُس بادشاہ کے پاس خدا کا دیا سب کچھ تھا پر نعمت سے اولاد کی محروم تھا۔ اسی غم میں رات دن روتا تھا اور جان اپنی کھوتا تھا۔ ایک دن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ایک فقیر ملک شام سے پھرتا پھرتا بادشاہ کے محل کے نیچے آیا۔

یہ آواز رات کے سناٹے کو ہلاک کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہے گی اور کہانی کا سفر جاری رہے گا۔ پھر نیند ان بچوں کو گھیرنے لگے گی اور جب ہُنکارا بھرنے والا کوئی نہ رہے گا تو بُوا کہانی ناتمام چھوڑ کر ایک ٹھنڈی سانس بھریں گی اور خوابوں کے محل میں بھٹکنے لگیں گی۔

اس محل میں خون کی سوگ نشیں یادوں کا رنگ بکھرا ہوا ہے۔ جہلم کی مٹی میں امانت کے طور پر سونے والا وہ شہید اور زندہ خون جو رگوں میں دوڑتا تھا تو اپنے ریلے میں فرنگیوں کو دور تک بہالے گیا تھا اور جب غلطاں نجاک ہوا تو اپنے خاندان کی پیشانی پر فخر و تمکنت کی تحریر لکھ گیا۔ وہ خون جس کا سفر سہسرام سے شروع ہوا اور جہلم کی مٹی میں آسودہ ہوا۔ اُس خون کا نمک بُوا اور ان کی اولادوں کے بدن میں اتنی دور تک اُتر گیا کہ اب ان کے خوابوں میں بھی اس خون کی سوگ نشیں یادیں ہیں۔ بیچاری بُوا اور ان جیسے بیچارے تمام لوگ خداوند خدا کے بنائے ہوئے عظیم نظام کے حقیر بندے۔

خداوند خدا کی تعظیم کرو کہ اس نے انسانوں کو طبقوں میں تقسیم کیا اور پھر ان طبقوں میں کچھ کو حاکم اور کچھ کو محکوم کیا۔

خاموش رہو، یہاں سب چُپ سادھے ہوئے ہیں۔ در دل میں آویزاں آنکڑوں میں لٹکتی ہوئی لالٹینیں حسبِ معمول جھول رہی ہیں، ہوا کی تیزی سے ان کی لَو

کبھی تیز ہو جاتی ہے تو کچے شیشے پر کاجل کی لکیر کھنچ جاتی ہے۔

میں نے اُس آنگن میں کاجل کی بہت سی لکیروں کا منہ دُھلتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ سسکیاں آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہیں جو اس آنگن میں آدھی رات کے بعد اُبھریں اور پھر اسی آنگن کی مٹی میں دفن ہو گئیں۔ وہ کبھی کبھی محبتیں اور نرم و نازک سائے جو سوزِ دروں سے شمع کی طرح پگھل کر بہ گئے۔ کسی کے لبوں کو چھونے کی آرزو میں کانپتی ہوئی انگلیاں اور کسی کے قدموں کی چاپ سن کر زرد پڑ جانے والے چہرے۔ اب نہ وہ چاہنے والے رہے اور نہ وہ محبتیں اور رفاقتیں رہیں۔ سب کچھ ختم ہوا، وقت کی آگ میں بھسم ہوا۔ اُس آنگن میں جس میں میری آنکھوں کے سامنے نہ جانے کتنی ڈولیاں اتریں اور نہ جانے کتنے ڈولے وہاں سے اُٹھے، اب وہاں کچھ نہیں، خاک اڑتی ہے۔ "جائے عبرت سرائے فانی ہے۔" اب یہ باتیں خواب ہیں، طرحدار اور توانا زندگی کے تمام مناظر وقت نے اس طرح لپیٹ دیے جس طرح کینوس پر بنے ہوئے کسی ڈرامے کے مختلف سین ڈنڈوں پر لپیٹ دیے جاتے ہیں۔ تو گویا وہ سب لوگ اور وہ تمام چیزیں جو زندہ تھیں اور تا ابد زندہ رہنے کی خواہش رکھتی تھیں کسی ڈرامے کے بے جان منظر کی طرح تاریخ کے ڈنڈوں پر لپیٹ دی گئیں لیکن میں اپنی یادوں کے مناظر لپیٹنے کی بجائے کھول دیتی ہوں۔

میں جب زخمی بدن یہاں لائی گئی تو گلاب کی ایک چھوٹی سی شاخ تھی اور اب ایک اونچا پودا ہوں۔ نوکیلی مونچھوں والا یہ بوڑھا مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ اُس نے یہاں اس چبوترے کے پاس بہت حفاظت سے مجھے پرورش کیا ہے اور پھر اس نے میرے وجود کو تقسیم بھی کیا ہے۔ میرے وجود کی قلمیں دوسری کیاریوں میں پھیلی ہوئی ہیں لیکن میں آج بھی اپنے آپ کو گلاب کی وہی زخمی شاخ محسوس کرتی ہوں جسے یہ شخص اپنے پردادا اور نگر دادا کے گھر سے اس مکان میں لایا تھا۔ یہ شخص نہیں جانتا کہ جب وہ مر جائے گا تو اس کے بیٹے اور پوتے اور بہوئیں اس کے پروردہ درختوں اور

پلو دوں کو پلٹ کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ وہ عظیم اور حقیر دور ختم ہوا جب باپ کی چھوڑی ہوئی بے قیمت چیز بھی بیٹے کی قیمتی میراث ہوتی تھی۔ یہ سب لوگ جو اپنے اپنے سینوں میں چاند پر جانے کی خواہش چھپائے بیٹھے ہیں یہ سب حال کے باشندے ہیں، یہ خلاء سے آئے ہیں اور خلا ہی میں گم ہو جائیں گے۔ گمنامی ان کا مقدر ہے اور گمراہی ان کا راستہ۔ سو انھیں ان کی راہ پہ چلنے دو کہ انسانوں کا ہر گروہ اسی راہ پر چلتا ہے جو اس کا مقسوم ہے اور ہاں مقسوم کیا ہے؟ یہ میں نہیں جانتی اور جانتی بھی ہوں۔ کتنی دلچسپ بات ہے کہ مقسوم کو میں نہیں مانتی اور مانتی بھی ہوں۔

آج میرے بدن پر کوئی گلاب نہیں کھلا ہے، میری باہیں خالی ہیں اور دل کسی ویران گھر کی طرح بھائیں بھائیں کرتا ہے۔ اس خالی گھر میں ہوا گزری ہوئی آوازوں، کہی ہوئی باتوں اور بھولی بسری یادوں کا ناٹک رچاتی ہے، پردہ اٹھتا ہے اور پردہ گرتا ہے، پردہ اٹھتا ہے اور پھر اٹھتا ہی چلا جاتا ہے۔ حجاب درمیاں آتے ہیں اور بڑھتے جاتے ہیں، پرچھائیاں نزدیک آتی ہیں اور دُور ہو جاتی ہیں۔ آواز اُبھرتی ہے پھر معدوم ہو جاتی ہے۔ عدم اور وجود سب وقت کا کھیل ہے اور آواز بھی عدم میں ایک وجود ہے۔ عدم میں ایک وجود؟ یہ بھی خوب رہی۔ سر بُریدہ آوازیں، بصارت سے محروم مناظر اور آنے والے دنوں کے چھلاوے میرے سامنے موت کا رقص کرتے ہیں اور جب میں چیخیں مارتی ہوں تو یہ تمام سراب اور سائے معدوم ہو جاتے ہیں، یہ جو عدم سے وجود میں آئے تھے پھر عدم کی سرزمین کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ لیکن میرے لیے واپسی کی تمام راہیں مسدود ہیں۔ چاروں کھونٹ آسمان کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے دیو پہرا دیتے ہیں اور ہواؤں کے اُڑن کھٹولے میں بیٹھ کر خوشبوئے پیرہنِ یوسف کی سواری بھی نہیں آتی۔

سواری نہیں آتی اور مجھے کہیں کا بھی راستہ نہیں ملتا۔ میں "ناگا آباد" سے سفر پہ نکلی تھی، راستے میں اسمِ اعظم میرے ذہن سے محو ہوا اور اب "ناگا آباد" کا راستہ میں بھول

پر جھکی ہوں۔ قبیلے جب ہری بھری چراگاہوں سے منہ موڑتے ہیں اور اپنے خیموں سے انحراف کرتے ہیں تو اسم اعظم ان کے حافظے سے محو ہو جاتا ہے۔

میں اور تم، ہم سب راستے سے بھٹکی ہوئی روحیں ہیں، دیوالی کے دیے جلاؤ کہ آفتاب برج میزان میں آ پہنچا اور اب لکشمی دیوی اپنے بیٹے بل راج کو تحت الثریٰ سے آزاد کراتی ہے۔ گھروں کی منڈیروں پر اور طاقوں اور دیواروں پر اتنے دیے جلاؤ کہ ہوائیں اور فضائیں روشن ہو جائیں اور ہم بھی بل راج کی طرح تحت الثریٰ کی قید سے نجات پائیں۔ پھر ہم دیوں کی روشنی میں اپنی روحوں کو دھوئیں گے، انہیں روشنی کی الگنی پر پھیلائیں گے اور پھر اپنی روشن روحوں کو پہن لیں گے۔ ہم اپنی روحوں کو اس طرح پہن لیں گے جس طرح پھول خوشبو کو پہنتا ہے، شمع روشنی کو پہنتی ہے اور دل عشق کو پہنتا ہے۔

دھوپ اب نہ ستونوں پر ہے اور نہ مٹی کے ذروں میں، اب صرف دھوپ کا سایہ ہے اور اس سائے کی روشنی میں پرندے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ ان پرندوں کے شور کے ساتھ میرے کانوں میں ایک بھاری بھرکم اور سریت آمیز آواز گونجتی ہے۔ لکھ جتن جتن محل بنایا، نا گھر تیرا نا گھر میرا، یہ سب ہے چڑیں رین بسیرا۔ اور پھر چمٹے کی آواز ان بولوں پر چھا جاتی ہے۔ یہ آواز اور اسی طرح کی دوسری بہت سی آوازیں جو زندگی کا رمز سمجھاتی تھیں، کھو گئی ہیں اور حافظے کا شہر چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہیں۔

بے ڈھنگی آوازوں کا شور ہے۔ ملازموں نے کرسیاں گھسیٹنی شروع کر دی ہیں۔ میں اس اہتمام کو دیکھتی ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ چبوترا ایک چھوٹا سا اسٹیج ہے۔ حکمرانوں کا دیا ہوا راتب نہ کھلانے والوں کی اور سولیاں پانے والوں کی اولادیں اپنے اپنے مکالمے دہراتی ہوئی اسٹیج پر آتی ہیں۔ وقت اور تاریخ کے جبر نے انہیں جو کردار دیے ہیں، انہیں نہایت شکر گزاری اور فرمانبرداری کے ساتھ ادا کرتی ہیں۔

میں ان چہروں کو دیکھتی ہوں تو چیخ چیخ کر کہتی ہوں کہ اپنے مکانوں میں چھپ جاؤ، تمام

دروازے، کھڑکیاں اور روشندان بند کر لو، پھر اپنے ناخنوں سے سرنگیں کھود کہ فرمانبرداروں
اور شکرگزاروں کے لیے پناہ کہیں نہیں ہے۔

دریائے جہلم کے کنارے پیپل کا ایک پیڑ سر اٹھائے جھومتا ہے، اس کی شاخوں پر
نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ شکرگزاروں اور فرمانبرداروں میں سے نئے لوگ اُمڈ رہے ہیں۔
یہ مستقبل کو پہنیں گے اور قرمزی مسافتوں کو طے کریں گے۔ یہ اپنی اپنی راہ جائیں گے اور میں
ناکجاآباد کا راستہ ڈھونڈتی ہوں۔

زیتون کی ایک شاخ

بوندیں چمپا کی خوشبو پر، کامنی کی رنگت پر اور مٹی کی پیاس پر برس رہی ہیں۔
کمرے کے اندر بھولے بسرے گیتوں کے بول بکھرے ہوئے ہیں۔ مینھ کی بوندیں
اور گیتوں کے بول کھرنڈ جمے ہوئے زخموں پر برستے ہیں تو زخم جیسے کھل اٹھتے ہیں۔

بوندیں برس رہی ہیں اور زخموں کے گلاب کھلے ہیں، ان گلابوں کی شاخوں
پر ابھرے ہوئے نوکیلے کانٹے یاد کی انگلیوں میں چبھتے ہیں تو کچھ سوچنے کو جی چاہتا ہے
اور نہ کرنے کو۔ میں الجھ کر میز پر رکھا ہوا "پاکستانی ادب" اٹھاتی ہوں، یہ اس کا "امریکی ادب
نمبر" ہے۔ میں اس کی ورق گردانی کرنے لگتی ہوں، میں صفحوں پر صفحے پلٹتی ہوں۔ پھر میری
نگاہیں ایک صفحے پر رک جاتی ہیں۔

اور تب یاد کی انگلیاں وقت کی بند مٹھی میں پھڑپھڑاتے ہوئے لمحوں کے ان
پرندوں کو محسوس کرنا چاہتی ہیں جو موجود کی شاخ سے اڑے اور ناموجود کی طرف
پرواز کر گئے۔ لمحوں کے یہ پرندے وقت کی بند مٹھی میں تڑپتے ہیں اور اب یہ کبھی مائل بہ پرواز
نہ ہوں گے۔ لیکن یاد کی انگلیاں ان کے وجود کی گرمی اور خوشبو اور ان کے بدن کی
کپکپاہٹ کو محسوس کرنا چاہتی ہیں۔ یاد کے ہونٹ ان ناموجود پرندوں کے بدن پر اپنے

ہونٹ رکھنا چاہتے ہیں۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا میں نے لکھتے لکھتے نگاہیں اٹھا کر دیکھا تھا۔ شیشے کی بلند و بالا دیوار کے ادھر مینھ کا جھالا برس رہا تھا۔ اور بارش کے بہت سے قطرے اس شفاف دیوار پر اس طرح رُکے ہوئے تھے جیسے وہ شیشے کی دیوار نہ ہو دیوارِ گریہ ہو۔

سامنے ذرا فاصلے پر بنے ہوئے گیسٹ ہاؤس کا سرسبز لان، پھولوں کے بوجھ سے لچکتے ہوئے پودے اور آتش رنگ کلیوں سے ڈھکے ہوئے پیڑ مجھے صاف نظر آرہے تھے۔ یہ سب کچھ تھا لیکن پیاسی زمین اور مینھ کے وصال کی آنچ اور خوشبو کہیں نہیں تھی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں اپنے گھر کے آنگن میں نہیں، امریکی کونسلیٹ کے اسنیک بار میں بیٹھی ہوئی تھی اور کونسلیٹ از فرش تا عرش ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ شیشے کی ان دیواروں کے پیچھے سے میں اُڑتے ہوئے بادل، مینھ کے جھالے اور سڑک پر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پانی کو دیکھ تو سکتی تھی لیکن محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ پیاسی مٹی کی سوندھی خوشبو کے اور میرے درمیان یہ شفاف دیواریں حائل تھیں۔

اس لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں شیشے کے ایک بلند و بالا محل میں مقید ہوں جہاں قدم قدم پر نیلی آنکھوں والے سفید دیو پہرا دیتے ہیں۔ اس احساس کے ساتھ ہی میں بے چین سی ہو گئی۔

ٹھنڈی کافی کا ایک گھونٹ لے کر میں نے ایک بار پھر لکھنے میں مصروف ہونا چاہا لیکن چند لمحوں میں مجھے احساس ہو گیا کہ خیال کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے اور ذہن میں پگھلتے ہوئے نت نئے سانچوں میں ڈھلتے ہوئے الفاظ اچانک میری گرفت سے نکل گئے ہیں۔ میں نے بے بسی کے عالم میں اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں پر نظر ڈالی، کتنے خوش و خرم چہرے اور کیسے تر و تازہ بدن یہاں آباد تھے۔

برابر کی میز پر بیٹھے ہوئے لڑکوں نے کسی بات پر زور کا قہقہہ مارا۔ اور ان ہی پر کیا منحصر تھا، اسنیک بار میں تو ہر طرف قہقہوں کی دھنک نکلی ہوئی تھی۔ کل رات ویت نام جانے والا امریکی بحری جہاز کراچی کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا تھا اور صبح سے ہی کونسلیٹ کی راہداریوں میں بھانت بھانت کے امریکی لڑکے نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ میرین یونیفارم میں تھے اور بعض امریکن آرمی کی وردی پہنے ہوئے تھے، بعض ایسے بھی تھے جو شوخ رنگ کی قمیصوں اور نکروں میں تھے۔ یہ سب لڑکے جن کی ابھی کھانے کھیلنے کی عمریں تھیں اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ایک ایسی جنگ لڑنے جا رہے تھے جو ان کی اپنی جنگ نہ تھی۔

میں نے ان لڑکوں کے چہروں پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ یہ ہنستے کھلکھلاتے چہرے نجانے کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتاریں گے اور ان میں سے نہ جانے کتنے خود بھی خاک و خون میں لپٹے ہوئے موت کی نیند سو جائیں گے۔ ایک لمحے کے لیے دکھ کا سایہ میرے ذہن کے افق پر لہرایا اور پھر گم ہو گیا۔

لیکن یہ سب کچھ ان کا انتخاب تھا، پھر اس انجام پر دُکھ کیسا؟ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ انہیں انسانوں کے کسی گروہ کو کچلنے کا بھلا کیا حق پہنچتا ہے؟ میں نے سوچا اور میری نگاہوں میں وہ تمام تصویریں گھوم گئیں جو ہر دوسرے تیسرے اخباروں اور رسالوں میں چھپتی تھیں۔ شمالی ویت نامیوں کی لاشوں پر قہقہہ لگاتے ہوئے امریکی فوجیوں، ماؤں سے بچھڑے ہوئے ننھے بچّوں اور نیپام بموں سے جھلسے ہوئے چہروں کی تصویریں۔ انہی دنوں برٹرینڈ رسل کی مشہور کتاب "ویت نام میں جنگی جرائم" شائع ہوئی تھی، میں نے اس کتاب کو کئی مرتبہ پڑھا تھا اور ہر مرتبہ میری آنکھیں اشکبار ہوئی تھیں اور ہر مرتبہ میرے دل میں اس بوڑھے فلسفی کے لیے محبت کے اور عقیدت کے سوتے اُبلے تھے۔ یہ شخص مجھ جیسے کمزور انسانوں کے لیے منارہ

نور کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ شخص جو مذہب، رنگ، نسل اور زبان کی تفریق سے بلند
ہو کر سوچتا تھا۔ رسل کا خیال آتے ہی میری نظروں کے سامنے اس بدھ بھکشو کی تصویر گھوم
گئی جس نے امریکی جارحیت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنے آپ کو نذرِ آتش
کر دیا تھا۔ زندگی دنیا کے تمام انسانوں کو کس قدر محبوب تھی۔ لیکن مہاتما بدھ کے اس
ماننے والے نے دوسروں کے لیے جینے کا حق طلب کرتے ہوئے اپنی زندگی بھینٹ
کر دی تھی۔ یہ مشہور اور یہ گمنام لوگ کتنے بڑے تھے، کیسے بلند و بالا تھے۔ اور یہ سب
کچھ سوچتے ہوئے مجھے اپنے حال پر ہنسی آ گئی۔

کتنی عجیب سی بات ہے کہ میں امریکی کونسلیٹ میں ملازم ہوں، وائس آف
امریکہ کی اردو سروس میں پروگرام پروڈیوسر اور اسکرپٹ رائٹر ہوں، دن رات پاکستان
کو ملنے والی امریکی امداد کے بارے میں فیچر لکھتی ہوں اور ان سب باتوں کے باوجود امریکیوں
کی ہر بات سے اختلاف کرتی ہوں، ان کے ہنستے ہوئے چہروں کو دیکھ کر میرے وجود
میں جیسے زہر گھل جاتا ہے۔

میں نے پچھلے ایک برس میں امریکی امداد، امریکی عظمت اور امریکی نقطۂ نظر کے
بارے میں نہ جانے کتنے اسکرپٹ لکھے تھے اور کیسے نہ لکھتی۔ حکومتِ امریکہ ان بے معنی
اور بے روح باتوں کو دل نشیں انداز میں لکھنے کی منہ مانگی قیمت ادا کرتی ہے۔ میں اکثر
سوچتی کہ آئیڈیل، آدرش، خواب، یہ سب کتنے خوبصورت اور دل آویز الفاظ
ہیں۔ لیکن روپیا جو کہ محض مایا ہے اور ہر عہد میں لعنت قرار دیا گیا ہے، وہی دنیا کی سب
سے بڑی حقیقت ہے۔ خواب پیسے کے بغیر نہیں خریدے جا سکتے، آدرش کی باتیں
بھوکے پیٹ اور ننگے تن زیادہ دنوں تک نہیں چلتیں۔

کبھی کبھی میرا جی چاہتا کہ اپنے تمام اسکرپٹ کسی امریکی افسر کے منہ پر مار کر
بھاگ جاؤں اور پھر کبھی پلٹ کر اس شیش محل کا رُخ نہ کروں لیکن پھر مجھے خیال آتا

کر اپنے نقطۂ نظر کی خاطر مجھے ان لوگوں کو سزا دینے کا بھلا کیا حق پہنچتا ہے جن کا انحصار
صرف میری ذات پر ہے اور جو بہت بے بس، اور بہت مجبور ہیں۔ مجبوری اور
بے بسی کا یہ کتنا عجیب دائرہ تھا جس کے گرد ہم سب بے تکان چکر کاٹ رہے تھے۔
لیکن جس سے باہر نکل جانا، جس سے فرار حاصل کرنا ہم میں سے کسی کے بس میں
نہ تھا۔ لیکن نہیں، بات شاید صرف اتنی سی تھی کہ میں نے اپنی کمینگیوں کو چھپانے کے
لیے دوسروں کا بہانہ ڈھونڈ لیا تھا، میں کس قدر کمزور، کتنی بے بضاعت اور کیسی حقیر
تھی۔ میری آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔

میں نے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات کو دیکھا جن میں کچھ سادہ تھے اور کچھ
میری تحریر سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ دراصل Saul Bellow ساؤل بیلو کی
کہانی The Gonzaga Manuscript کی ریڈیائی تشکیل تھی جسے مجھے دوپہر
تک مکمل کرنا تھا۔ اور اسی لیے میں صبح ہی سے اسنیک بار میں چلی آئی تھی کہ یہاں بیٹھ
کر کافی پیوں گی اور اسکرپٹ پر کام کروں گی لیکن اب خیال کی رَو بہک کر نہ جانے کہاں
سے کہاں نکل گئی تھی اور میں بالکل خالی الذہن ہو گئی تھی۔

امریکی لڑکے اپنی عادت کے مطابق زور زور سے باتیں کر رہے تھے اور
شور مچا رہے تھے، "ابھی تو یہ آفت چار دن تک مسلط رہے گی"۔ میں نے بیزاری سے
سوچا۔ صبح میں جیسے ہی اسنیک بار میں داخل ہوئی تو مسز شیرازی نے باہر نکلتے ہوئے
یہ مژدۂ جانفزا سنایا تھا۔ وہ بہت خوش تھیں کیونکہ اس طرح جہاز پر موجود کچھ نئی اور غیر
سنسر شدہ فلمیں کونسلیٹ میں کام کرنے والے دیکھ سکیں گے۔

میں نے آگے کی طرف جھک کر نیچے دیکھا۔ سفید ٹائلوں والے تالاب کے
کنارے چھلکے پڑ رہے تھے اور ان پر برستے ہوئے مینھ کے قطروں سے جا بجا حباب
بن رہے تھے اور ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ موسم بہت دنوں بعد اتنا خوبصورت

اور اس قدر ظالم ہو گیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں شہر کی سڑکوں پر بارش میں بھیگتی ہوئی چلتی رہوں یہاں تک کہ سمندر کے کنارے جا پہنچوں اور وہاں اُس بے چین اور بے قرار پانی کو دیکھوں جو نہ جانے کن شہروں اور ویرانوں کو چھوتا ہوا یہاں تک آتا ہے۔

"ایکسکیوز می" کسی نے مجھے مخاطب کیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا ایک لمبا تڑنگا امریکی لڑکا ایک ہاتھ میں بیئر کارٹن اور دوسرے ہاتھ میں برف کی ڈلیوں سے بھرا گلاس تھامے کھڑا تھا۔

"دراصل یہاں اس نشست کے سوا کوئی اور خالی جگہ نہیں ہے۔" اس نے ذرا شرمندہ سے لہجے میں میز کے گرد پڑی ہوئی دوسری خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے کوفت سی ہوئی لیکن پھر خیال آیا کہ میں تو اب یہاں سے اٹھنے ہی والی ہوں پھر یہاں کوئی بھی بیٹھے مجھے کیا۔ میں نے میز پہ بکھرے ہوئے کاغذات اور ساؤل بیلو کی کہانیوں کا مجموعہ سمیٹ کر ایک طرف کر دیا اور وہ لڑکا شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"تم کونسلیٹ میں کام کرتی ہو؟" اس نے سنہرے رنگ کی بیئر شفاف گلاس میں انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"میں وائس آف امریکہ کی اردو سروس میں پروگرام پروڈیوسر ہوں۔"

"اچھا!" اس نے کچھ اس طرح سے کہا جیسے اسے یہ سُن کر قدرے حیرت ہوئی ہو، میں نے اُسے تیز نظروں سے دیکھا وہ سمجھ گیا کہ میں نے اُس کے لہجے کی حیرت کو پسند نہیں کیا۔ "دراصل مجھے پاکستانی لڑکیوں کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"ایشیا کے بارے میں امریکیوں کو واقعی کچھ زیادہ معلوم نہیں۔" میری زبان سے

بے اختیار ایک طنزیہ جملہ پھسل گیا جسے سن کر وہ خوش دلی سے مسکرایا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی چند لمحوں کے لیے مسکراہٹ میں چھپ گئی ہے۔

میں نے کاغذات اور کتاب سمیٹ کر اٹھنا چاہا تو اس نے اپنا ہاتھ میرے کاغذات پر رکھ دیا۔ "میرا مقصد تمہارے کام میں خلل اندازی نہیں تھا۔ تم اپنا کام مکمل کر لو۔"

"تمہارے یہاں بیٹھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اپنا اسکرپٹ اپنے کمرے میں بیٹھ کر مکمل کر لوں گی۔" میں نے کہا۔

"اگر تم یوں اٹھ کر چلی جاؤ گی تو مجھے شرمندگی ہو گی، اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ میں تنہا ہوں اس لیے تمہارے دس پندرہ منٹ کے ساتھ کو غنیمت سمجھوں گا۔" اس نے متانت سے کہا۔

"لیکن یہاں تمہارے اتنے بہت سے ساتھی موجود ہیں پھر تنہائی کا بھلا کیا سوال ہے۔" میں نے ان لڑکوں کی طرف اشارہ کیا جو چند لمحے پہلے اندر داخل ہوئے تھے اور نشستیں خالی نہ ہونے کی وجہ سے کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے کوک یا بیئر پی رہے تھے۔

"ان لڑکوں میں میرا جی نہیں لگتا۔" اس نے آہستہ سے کہا اور بیئر کا گلاس اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ وہ نہ جانے کس قسم کا انسان تھا میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کے سنہرے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور وہ آنکھیں جھکائے بڑی سنجیدگی سے بیئر کے جھاگ کو دیکھ رہا تھا۔ اور پھر میں اپنی خواہش کے برخلاف وہاں سے نہ اٹھ سکی کیونکہ میرے اندر ایک نامعلوم سا جذبہ تجسس سر اٹھا رہا تھا۔ یہ لڑکا نوجوان تھا اور دنیا کی دولت مند ترین قوم کا ایک فرد تھا۔ اس کے سامنے شاندار مستقبل پھیلا ہوا تھا۔ لیکن وہ محض اپنے ملک کے سینڈ اِن

اور صنعت کاروں کی ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لیے ایک ایسی سرزمین کی طرف جارہا تھا جہاں خون کا سمندر بہہ رہا تھا اور شاید اس کا گرم اور جوان خون بھی اس سمندر میں شامل ہونے والا تھا۔ تو کیا یہ لڑکا واقعی اداس ہے؟

"میرا نام ایڈگر کوہن ہے۔" اس نے بہت غیر متعلق سے انداز میں مجھے اپنا نام بتایا، پھر جب میں نے اسے اپنا نام بتایا تو اس نے خالص امریکی لہجے میں میرا نام زیرِلب دُہرایا۔ "خاصا مشکل نام ہے۔" وہ آہستہ سے ہنسا، پھر اس کی نظر میری خالی پیالی کی طرف گئی۔ "تمہاری کافی ختم ہوگئی ہے ___ اب تم کیا پیو گی؟" اس نے پوچھا اور پھر وہ میرے انکار کے باوجود کاؤنٹر سے کوکا کولا کا ڈبا اور برف کی ڈلیوں سے بھرا ہوا گلاس لے آیا۔

پھر یوں ہوا کہ اس صبح مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اس بات کا ادراک ہوا کہ امریکی بھی انسان ہوسکتے ہیں اور وہ بھی ہماری طرح جنگ، محبت، بے وفائی اور موت کے دُکھ اٹھاتے ہیں۔

ایڈگر نے مجھے بتایا کہ وہ کیلیفورنیا کا رہنے والا ہے۔ اس نے کیلیفورنیا یونیورسٹی برکلے سے ساؤتھ ایشین اسٹڈیز میں ایم ایس کیا ہے اور اب Drafting یعنی جبری بھرتی کے قانون کے تحت ویت نام جارہا ہے۔ وہ بیئر کے گھونٹ بھرتا رہا اور مجھے اپنے بارے میں بتاتا رہا۔ اس نے باتیں کرتے کرتے جیب سے والٹ نکالا، چمڑے کے اس پرس میں اس کی ماں کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میں نے اس چھوٹی سی رنگین تصویر کو دیکھا۔ کھپریل کی چھت والے چھوٹے سے گھر کے سبزہ زار پر ایک بوڑھی امریکی عورت کھڑی تھی۔ اس کے بیشتر بال چاندی کے رنگ کے تھے اور چہرے پر دُکھ اور تنہائی کے سائے پھیلے ہوئے تھے، یہ ایک شفیق اور محبت کرنے والی ماں کا چہرہ تھا جس کے اکلوتے بیٹے کو محاذ پر بھیج دیا گیا تھا۔ اس چہرے کی کوئی

قومیت نہ تھی۔

"میرے ڈیڈی امریکن ایئر فورسس میں تھے۔ جب کوریا کی جنگ شروع ہوئی تو انہیں محاذ پر بھیج دیا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، مما ہر شام چرچ جاکر ان کے لیے جیزز کرائسٹ اور ہولی مدر سے دعائیں کرتی تھیں اور شمعیں جلاتی تھیں۔ لیکن ان کی دعائیں کسی کام نہ آئیں۔ ہاں، ایک دن ڈیڈ کے ختم ہونے کی خبر ضرور آ گئی۔ ان کے طیارے کو فضائی حملے کے دوران شمالی کوریا کے کسی گنر نے مار گرایا تھا۔ مما کا سوگوار چہرہ مجھے آج تک نہیں بھولتا۔ پھر مما بوڑھی ہو گئیں۔ آہستہ آہستہ ان کے سر کے بال سفید ہو گئے ــــ وہ مجھ سے چھپ کر راتوں کو روتی تھیں۔ انہیں ڈیڈ سے بہت محبت تھی اور ان کی شادی کو اس وقت صرف چھ سال ہوئے تھے۔ جب ڈیڈ کوریا بھیج دیے گئے۔ ہم نے انہیں ڈیڑھ سال سے نہیں دیکھا تھا۔ اور ہم نے تو ان کا آخری دیدار بھی نہیں کیا۔ ہم انہیں مہاگنی کے تابوت میں نہ لٹا سکے، ڈیڈ کا تابوت کسی بمبار طیارے کا ڈھانچا بنا اور ان کی یونیفارم ان کا کفن۔ پھر جب میں بڑا ہوا تو مما نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں کبھی فوج میں نہیں جاؤں گا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ مجھے جنگ سے اور خون سے نفرت تھی، جنگ میرے ڈیڈ اور ہماری مسرتوں کو نگل گئی تھی"۔ اس کی آواز جیسے کانپ گئی۔

"تاریخ سے مجھے بہت دلچسپی ہے، تاریخ کی کتابیں مجھے بالکل کہانیوں کی طرح لگتی ہیں۔ پھر جب میں نے ایم ایس کیا تو میں کسی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہونے کے خواب دیکھتا تھا۔ لیکن وہ خواب ہی کیا جو پورے ہو جائیں۔ اور اب مجھے خوابوں کی تعبیر یہ ملی ہے کہ میں کسی کالج میں تاریخ پڑھانے کی بجائے ویت نام جا رہا ہوں۔ وہاں لوگوں کو گولیوں کی زبان سکھاؤں گا۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے

کہ اپنی انگلیاں کاٹ کر پھینک دوں تاکہ میں کسی رائفل کی لبلبی دبانے کے قابل نہ رہوں۔ کبھی خودکشی کو جی چاہتا ہے پھر مجھے مما کا خیال آتا ہے۔ میں نہیں رہا تو وہ مر جائیں گی یا پھر شاید روتے روتے اندھی ہو جائیں گی۔ میں جہاز کے عرشے پر کھڑا پہروں سمندر کو دیکھتا تھا اور سوچتا تھا کہ سمندر میں کود جاؤں، لیکن پھر مجھے مما یاد آتیں، وہ میرے آنے سے پہلے بہت روتی تھیں۔" وہ بولتے بولتے چُپ ہو گیا۔ اس کا گلاس خالی ہو گیا تھا اور بیئر کا ٹِن بھی۔

وہ مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے اپنے دُکھوں کا مداوا پوچھ رہا ہو، جیسے اپنے زخموں کے لیے مرہم کا طلب گار ہو۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اس سے کیا کہوں، اسے کس طرح دلاسا دوں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ مجھے یہاں بیٹھے ہوئے بہت دیر ہو گئی ہے۔ میں نے اسنیک بار کی کیشیر مسز خان کی طرف دیکھا وہ کیش رجسٹر پر ہاتھ رکھے کھڑی تھیں اور میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ لیکن مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر انہوں نے فوراً نظریں چُرا لیں۔ میں کچھ بے آرام سی ہو گئی۔

"میں نے اپنی Morbid باتوں میں تمہارا بہت وقت ضائع کیا۔ حالانکہ تم کام کر رہی تھیں۔" ایڈگر کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

"تم نے قطعاً میرا وقت ضائع نہیں کیا اور نہ تمہاری باتیں Morbid تھیں۔ تمہارا احساس اور تمہاری تلخی بہت سچّی ہے۔ اس وقت جب تم باتیں کر رہے تھے تو مجھے ڈیوڈ مچل بہت یاد آیا تھا۔ تم نے اس کا نام ضرور سنا ہو گا۔ اس نے ویت نام جانے اور فوجی خدمات انجام دینے سے انکار کر دیا تھا اور اب اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ ڈیوڈ زیادہ باہمت اور زیادہ بہادر ہے، اس نے نہ جانے کا فیصلہ کیا اور اب نہایت فخر سے اس کی سزا بھگت رہا ہے۔ تم کھل کر انکار نہ کر سکے، شاید سماجی دباؤ کی وجہ سے، لیکن کم سے کم یہ تو ہے کہ تم جنگ کو قابلِ نفرت جانتے ہو اور اس احساس کا عذاب

سہہ رہے ہو۔ ورنہ بیشتر امریکی تو ابھی تک اپنی حکومت کے موقف کو درست سمجھتے ہیں۔ تم ڈیوڈ مچل نہیں ہو پھر بھی بہت قابلِ قدر ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اس نے نگاہیں جھکالیں شاید وہ ڈیوڈ مچل کا نام سن کر شرمندہ ہو گیا تھا۔

"تم صحیح کہہ رہی ہو۔ میں جنگ سے نفرت کرتا تھا اس کے باوجود مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں ویت نام جانے سے انکار کر دوں اور دوسروں کے استہزا اور تمسخر کا نشانہ بنوں اور سرکاری دباؤ برداشت کروں۔ میں بہت بزدل ہوں، محض خواب دیکھنے والا ایک سُست عنصر انسان اور کچھ بھی نہیں۔" اس نے بہت دل گرفتہ لہجے میں کہا اور ایک لمحے کے لیے مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اس کے سامنے ڈیوڈ مچل کا نام کیوں لیا، اس کا ڈیوڈ سے موازنہ کیوں کیا۔

"میں نچلی منزل میں ۱۲۹ میں بیٹھتی ہوں تم اگر چاہو تو گھنٹے بھر بعد وہاں آ جانا۔ میں اتنی دیر میں اپنا کام نمٹالوں گی۔" میں نے کہا اور اپنی چیزیں سنبھالتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

اور پھر جب میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی ساؤل بیلو کی کہانی کا اسکرپٹ مکمل کر رہی تھی تو مجھے بار بار ایڈگر کا خیال آیا۔ میں ایڈگر جیسے ان بہت سے دوسرے نوجوانوں کے بارے میں سوچ رہی تھی جنہیں جنگ سے نفرت تھی لیکن چونکہ وہ بزدل تھے اس لیے خاموشی سے سر جھکا کر میدانِ جنگ کی طرف چل دیے تھے۔ جنگ پر جانا کس قدر ہولناک بات تھی، میری نگاہوں میں ایڈگر کا شاندار سراپا گھوم گیا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی حریت پسند کی گولی کا نشانہ بن جائے، یا کسی بارودی سرنگ پر پاؤں پڑتے ہی اس کے بدن کے چیتھڑے اُڑ جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس طرح زخمی ہو کہ اس کا ہاتھ یا اس کی ٹانگ کاٹ دی جائے۔ مجھے ایڈگر کی ماں کا خیال آیا۔ وہ کس قدر بدنصیب عورت تھی، اس کا شوہر جنگ کی بھینٹ چڑھا تھا اور اب اس کا بیٹا جنگ کے جہنم زار میں اُترنے والا تھا۔ میں لرز کر رہ گئی۔ اس وقت نہ جانے وہ کیا کر رہی ہو گی۔ شاید ایڈگر کو خط لکھ رہی ہو یا اُس

کے لیے پُل اُدور بن رہی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت جو کام کر رہی ہوگی وہ ایڈگر ہی سے متعلق ہوگا۔ میری اماں بھی تو اپنے اس بیٹے کے لیے ہی جیتی تھیں جو ہزاروں میل دُور جا کر بیٹھ رہا تھا۔ اور سات سال سے پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ دنیا کی تمام ماؤں کے دل شاید ایک ہی خمیر سے اٹھائے جاتے ہیں۔

☼

وہ جب آہستہ سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو میں اس کی طرف پُشت کیے ایک ڈراما ایڈٹ کر رہی تھی۔ یہ ڈراما اسٹیفن کرین کی مشہور کہانی The Red Badge of Courage کی ریڈیائی تشکیل تھا۔ میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"تم اپنا کام مکمل کر لو پھر باتیں کریں گے۔" ایڈگر نے کہا اور میری ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا میز کے ساتھ رکھی ہوئی کیبنٹ پر میری چند ذاتی کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ وہ ان کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا اور میں پھر ایڈیٹنگ مشین کی طرف متوجہ ہو گئی۔ پروگرام ایڈیٹنگ کی وجہ سے کمرے میں خاصا شور مچ رہا تھا۔ میں ٹیپ کو Rewind کرتی تو ناقابلِ فہم اُلٹی آوازیں کمرے کا سکون درہم برہم کر دیتیں۔ میں تیزی سے بیکار جملے اور مختلف "ٹیک" کاٹ کاٹ کر ڈسٹ بن میں پھینکتی چلی گئی۔ دس منٹ بعد تمام مکالمے تسلسل میں تھے اور اب مسئلہ صوتی اثرات کو شامل کرنے کا رہ گیا تھا۔ اور یہ کام آفریدی صاحب اور ریکارڈنگ روم کے شیڈول پر منحصر تھا۔ میں نے ٹیپ لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور ایڈیٹنگ مشین کا سوئچ بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری نظر اپنے کمرے کی کھڑکیوں سے باہر بھٹکی۔ کونسلیٹ کے عقبی حصّے کے سرسبز و شاداب لان پر ابھی تک ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور غضب کا سماں تھا۔

اس نے مجھے اٹھتے دیکھا تو میری ریوالونگ چیئر پر سے اٹھ کر مقابل کی ایک کرسی میں دھنس گیا۔

"ایڈگر، تم کچھ پیو گے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، اب مزید پینے کی ہمت نہیں۔ تمہارے آنے کے بعد سے اب تک میں بس پیتا ہی رہا ہوں۔ یوں بھی بیئر کے مگ میں غم ڈبوئے نہیں جا سکتے۔ اس لیے مزید پینا فضول ہے۔ تم میرے لیے کھانے کو کچھ منگالو، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"کیا کھاؤ گے؟" میں نے ریسیور اٹھا کر اسنیک بار کا نمبر ڈائل کرنا چاہا۔

"اپنی پسند کی کوئی بھی پاکستانی ڈش منگالو۔"

"لیکن یہاں تو کوئی پاکستانی ڈش ملے گی نہیں۔"

"اچھا۔ لیکن میں تو کوئی پاکستانی چیز کھانا چاہ رہا تھا۔" ایڈگر نے قدرے مایوسی سے کہا۔ میں اسے دیکھتی رہی پھر میں نے آہستہ سے ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ اس لمحے میرا جی چاہا کہ میں ایڈگر کے ساتھ کہیں باہر کھانا کھاؤں۔ موسم کس قدر خوبصورت تھا اور محاذ جنگ پر جانے والا یہ لڑکا کس قدر تنہا، اداس اور مضمحل تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں کونسلیٹ کی عمارت سے نکل کر پورٹیکو میں کھڑے تھے۔ ایئر کنڈیشنڈ عمارت سے باہر نکلتے ہی سوندھی مٹی کی خوشبو سے معطر ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی، میں اس خوشبو کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتی تھی۔

"تم یہیں پورٹیکو میں کھڑی رہو، میں آگے بڑھ کر ٹیکسی پکڑتا ہوں۔" ایڈگر نے کہا۔

"نہیں، مجھے بارش میں بھیگنا بہت اچھا لگتا ہے۔ ہم آگے بڑھ کر ٹیکسی پکڑ لیں گے۔" میں نے کہا۔ مجھے بارش میں بھیگنا بہت پسند تھا لیکن اس وقت پورٹیکو میں نہ رکنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہاں کھڑا دربان اور اس سے باتیں کرتا ہوا موٹر پول کا ڈرائیور اور شیشے کے دروازوں کے پیچھے سے

جھانکتا ہوا کر سچین ریسپشنسٹ مجھے ایڈگر کے ساتھ کسی ٹیکسی میں بیٹھتے دیکھے۔ میں جانتی تھی کہ اس وقت بھی وہ لوگ ایک دوسرے کو بڑے معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکرا رہے ہوں گے۔

میں ایڈگر کے پہلو بہ پہلو چلتی ہوئی بادلوں سے ڈھکے آسمان تلے آ گئی۔ سڑک پر دونوں جانب پانی جمع ہو گیا تھا اور ہم دونوں گندے پانی سے بچ بچ کر فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ ہمارا رخ ہوٹل میٹرو پول کی طرف تھا۔ پھر چند ہی لمحوں بعد سامنے سے ایک خالی ٹیکسی گزری تو ایڈگر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔ میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی "کولمبس" کا نام لیا۔ "کولمبس" دور افتادہ تھا اور بہت کم لوگ وہاں جاتے تھے۔

ہم جب "کولمبس" کے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے تو میری توقع کے عین مطابق ہال تقریباً خالی پڑا تھا۔ ایک دور افتادہ گوشے میں چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور بس، میں نے کونے کی ایک میز منتخب کی جہاں سے ہم شیشے کی بڑی کھڑکیوں سے باہر کا منظر دیکھ سکتے تھے۔

کھانے کا آرڈر دینے کے بعد میں ایڈگر کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ مجھے ایک چھوٹا سا بچہ لگا جس کی کوئی خواہش پوری نہ ہوئی ہو اور وہ اداس بیٹھا ہو۔

"ایڈگر" میں نے آہستگی سے اس کا نام لیا' وہ چونک گیا۔ "مجھے اپنے بارے میں بتاؤ' اپنی مما کے بارے میں بتاؤ"۔ میں نے کہا۔

"میں تمہیں کیا بتاؤں۔ اتنی بہت سی باتیں بتانے کے لیے ہیں۔ ویسے تم بہت اچھی سامع ہو' بولتی کم ہو اور سنتی زیادہ ہو۔ تم جیسے لوگ بڑے اچھے دوست ہوتے ہیں"۔ اس نے کہا "میں دیر سے سوچ رہا ہوں کہ کاش تم مجھے کیلیفورنیا میں ملی ہوتیں۔ ہم اچھے

دوستوں کی طرح ساتھ رہتے۔ پھر میں ویک اینڈ پر تمہیں مما کے پاس لے جاتا‘ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوتیں۔“ وہ خوابناک سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

وہ محاذ پر جانے والوں کی مخصوص نفسی کیفیت سے دوچار تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ چند لمحوں کی شناسائی کو دوستی‘ محبت اور نہ جانے کیا کیا فرض کرنا چاہتا تھا۔ مجھے جنگِ عظیم پر لکھے جانے والے کئی ناول اور ان کے کردار یاد آئے۔ شاید موت کا سامنا کرنے والوں کو ایسے سہارے بھی بہت ہوتے ہیں۔“ بچوں کی طرح جاگتے میں خواب نہ دیکھو۔ اگر محاذ پر بھی اسی طرح خواب دیکھتے رہے تو یہ خواب تمہاری جان لے کر ٹلیں گے۔“ میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

”میں خواب نہیں دیکھ رہا‘ صرف خواہش کر رہا ہوں۔ محاذ پر جانے والے کم از کم آرزو کا حق تو رکھتے ہیں۔“ اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں خاموشی سے اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس جملے کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ چند لمحوں تک خاموش رہا پھر اس نے گفتگو شروع کر دی۔”تم مجھے یہی الزام دو گی کہ میں جاگتے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن یقین کرو‘ اگر تم مجھے وہاں مل جاتیں تو میں تمہیں اپنے گھر لے جاتا اور اپنی لائبریری دکھاتا۔ تمہیں یقیناً کتابوں سے خاصی دلچسپی ہے۔ میں نے ابھی تمہارے کمرے میں کئی بہت اچھی کتابیں دیکھی ہیں۔ میری ذاتی لائبریری میں تاریخ کے علاوہ لٹریچر کی بہت سی کتابیں ہیں۔ دراصل میں تاریخ اور ادب کو دو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کر سکتا۔ یونان کی تاریخ کی بہت سی الجھنیں یونانی ادب پڑھے بغیر سمجھ میں نہیں آتیں۔ اسی طرح اگر ہمیں لوئی چہاردہم کا عہد سمجھنا ہے تو اس کے لیے ادب کی عینک لگانی پڑتی ہے۔ اگر ہم انقلابِ فرانس کی راہ ہموار کرنے کے اسباب تلاش کریں تو مادام ژفرین اور ان کے سالون‘ اور وہاں جمع ہونے والے چند ادیبوں اور فن کاروں کے ذکر سے فرار ممکن نہیں۔ چھوڑو ہٹاؤ ان باتوں کو۔ میں بھی بھلا کیا باتیں لے بیٹھا۔“ اس نے نیپکن سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"تم قطعاً بے کار باتیں نہیں کر رہے۔ مجھے تمہارے نقطۂ نظر سے اتفاق ہے۔ تم نے جنوبی ایشیا کی تاریخ میں ایم ایس کیا ہے، اس لیے تم نے ہماری تاریخ تو یقیناً پڑھی ہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"تمہاری تاریخ؟ یعنی پاکستان کی تاریخ؟"

"میرا مطلب ہے کہ برصغیر ہندو پاک کی تاریخ۔" میں نے کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا اگلا جملہ کیا ہو گا۔ ہر امریکی اس موضوع پر بات کرتے ہوئے یہی کہتا اور امریکیوں پر ہی کیا منحصر تھا، اس بارے میں تمام غیر ملکی ایک طرح سے سوچتے تھے۔

"ہاں برصغیر کی تاریخ ہمارے نصاب میں تھی۔ لیکن واقعی تم لوگوں کا جواب نہیں ہے۔ پاکستان میں رہتے ہو اور پورے برصغیر کی تاریخ کو اپنی تاریخ کہتے ہو۔ لاکھوں انسانوں کے خون سے تم نے اپنے ملک کی سرحدیں کھینچی ہیں۔ تمہارا سرحد پار کی تاریخ سے بھلا کیا تعلق؟" وہ خوش دلی سے ہنسا۔

"مجھے معلوم ہے۔ تم سب ہمارا مذاق اڑاتے ہو اور تم بھی اپنی جگہ صحیح کہتے ہو۔ ہم نے ایک ملک کو تقسیم تو کر دیا لیکن اپنا ماضی کاٹ کر نہ پھینک سکے۔ ہماری کتنی ہی چیزیں وہیں رہ گئیں کیونکہ وہ دھرتی کا حصہ تھیں۔

"تاج محل جس پر تم امریکی جان دیتے ہو وہ ہم نے بنایا۔ غالب جس کی شاعرانہ عظمت کے ڈنکے ان دنوں انگلستان میں پٹتے ہیں وہ ہمارا تھا، ہم ہیں سے تھا۔ اشوک کے کتبے اور نالندہ کے کھنڈرات جتنے ان کے تھے، اتنے ہی ہمارے بھی تھے۔ سب کچھ ہمارا اور ان کا مشترک سرمایہ تھا۔ تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی، تم نے ہماری صرف تاریخ پڑھی ہے، ہمارا ادب نہیں پڑھا۔ تم کچھ نہیں جانتے، ہمیں سمجھنا چاہتے ہو تو ہمارا ادب پڑھو۔ میں اب تک جتنے غیر ملکیوں سے ملی ہوں وہ سب اسی طرح باتیں کرتے ہیں۔ اس میں تم لوگوں کا قصور نہیں، بات صرف اتنی سی ہے کہ تم ہماری دکھتی

رگ پر ہاتھ رکھ دیتے ہو اور ہم تڑپ اٹھتے ہیں۔ تمہارے نام کے ساتھ کوہن لگا ہے
تم یہودی ہو اور تم نے سیکڑوں برس ہجرت کا عذاب سہا ہے لیکن کیسی دلچسپ بات
ہے کہ تم ان فلسطینیوں کا دکھ نہیں سمجھتے جنہیں اپنے گھروں سے نکلنا پڑا اور تم ہمارے
عذاب بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ہم کہ پہلے برٹش انڈیا کی قومیت رکھتے تھے اور اب پاکستان
میں مہاجر ہیں۔ ہم بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑیں ہیں۔ تمہیں یرمیاہ جیسا نوحہ گر ملا تھا
لیکن ہمیں تو کوئی یرمیاہ بھی میسر نہیں آیا۔" میں نے الجھ کر باہر دیکھا۔ میری طبیعت
گھبرانے لگی تھی۔ موسم کا حسن نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔

"تاریخ دراصل بہت الجھا ہوا معاملہ ہے، اس کی بات کرنے بیٹھو تو گفتگو
ہمیشہ غلط رنگ اختیار کر لیتی ہے۔" ایڈگر نے نیپکن سے اپنے ہونٹ صاف
کرتے ہوئے کہا۔

"میں اب گھر جاؤں گی۔"

"کل تم سے ملاقات ہو سکے گی یا نہیں؟" ایڈگر نے میری آنکھوں میں دیکھتے
ہوئے پوچھا۔

"میں تمہیں ایک بجے کے بعد اپنے کمرے میں ملوں گی۔ کل صبح مجھے ایک
ڈراما ریکارڈ کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

"بس تو پھر طے ہو گیا۔ ہم دونوں کل دوپہر کا کھانا اکٹھے کھائیں گے اور اس
کے بعد بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" ایڈگر نے خوش ہو کر کہا۔ عجیب لڑکا تھا، چند گھنٹوں کی
ملاقات میں اس طرح کھل گیا تھا جیسے برسوں کا شناسا ہو۔ اور اب کتنے آرام سے
کل دوپہر کا پروگرام بنا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا جی چاہا کہ کوئی بہانہ کر دوں لیکن
یہ لڑکا جو گھر سے اتنی دور تھا اور شدید تنہائی کا شکار تھا، اسے مایوس کرنا میرے
لیے ممکن نہ ہو سکا۔

"ایڈگر اب چلنا چاہیے، بہت دیر ہو گئی ہے۔" میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ باہر بارش تھم گئی تھی اور بادل چھٹتے جا رہے تھے۔

ہم دونوں "کولمبس" سے نکل کر باہر آ گئے۔ تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد ہمیں ٹیکسی مل گئی۔ "میں تمہیں کونسلیٹ کے قریب اتار دوں گی۔" میں نے کہا اور وہ سر ہلا کر میرے برابر بیٹھ گیا۔ میں نے کونسلیٹ کے برابر ٹیکسی رکوائی تو وہ "کل ملیں گے" کہہ کر اتر گیا۔ ٹیکسی آگے بڑھی تو میں نے پلٹ کر دیکھا، اس نے مجھے پلٹتے دیکھا تو ہاتھ ہلانے لگا، میں نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا۔ ٹیکسی مڑی اور پھر وہ میری نگاہوں سے غائب ہو گیا۔

☼

اس رات میں نے عجیب خواب دیکھے۔

دھان کے کھیتوں میں بچے بھاگ رہے تھے، یہ کھیت سرخ پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور بھاگتے ہوئے بچوں کی آنکھیں بے نور تھیں! اور ان کے ہاتھ نہ تھے۔

وہ بچے تھے اور کھیتوں میں اپنی کھوئی ہوئی چیزیں ڈھونڈ رہے تھے۔ اپنے ہاتھ، اپنی آنکھیں اور تب بچوں کے اس ہجوم کے درمیان ایک فاختہ آسمان سے زمین کی طرف گری۔ اس کی چونچ میں زیتون کی ایک شاخ تھی اور اس شاخ پر پتے کی جگہ امریکی پرچم تھا، پرچم پر کیچڑ کے دھبے تھے اور اس پر نیلے ستارے چمک رہے تھے۔ دست بریدہ اور بے نور آنکھوں والے بچے ان نیلے ستاروں کی طرف لپکے، ان میں سے ہر بچہ دوسرے بچے سے پوچھتا تھا: "تمہاری ماں کہاں ہے۔ ہر جگہ بس آگ اور دھواں ہے۔" پھر بہت سی آوازوں نے بچوں کی آواز کے ساتھ آواز ملائی۔ دھواں ہے، دھواں ہے۔ ہر طرف ان الفاظ کی بازگشت تھی۔ چوک میں الاؤ کی طرح جلتے ہوئے بھکشوؤں کے بدن سے دھواں بل کھاتا اٹھ رہا تھا اور آسمان کی طرف بلند ہو رہا تھا۔ دھوئیں کے اس مینارے پر ایڈگر کھڑا تھا۔ اپنی ہتھیلی پر اپنا سر اٹھائے، پھر وہ بھاگنے لگا۔ جلتے

ہوئے تیر اس کے تعاقب میں تھے۔ اس نے ٹھوکر کھائی اور اس کا سر لڑھکتا ہوا دھان کے ایک کھیت میں جا گرا۔ اس کا سنہرے بالوں والا سر دھان کے کھیت میں کھڑے سرخ پانی پر تیر رہا تھا۔ کھلی آنکھوں میں خوبصورت دنوں کے خواب تھے اور ان خوابوں پر سوگ کی سیاہ چادر تھی۔

پھر مجھے پوسیڈون کا جوان سال بیٹا ایلی روتھیس نظر آیا۔ وہ ہاتھوں میں ایک طلائی کلہاڑی لیے ہوئے زیتون کے اس سرسبز درخت کی طرف بڑھ رہا تھا جو اس کے باپ کی شکست کا نشان بن کر زمین سے پھوٹا تھا۔ ایلی روتھیس نے کلہاڑی اٹھائی اور زیتون کے اس درخت پر وار کیا لیکن اس کا وار خالی گیا اور اس کی دھاردار کلہاڑی خود اس کے اپنے پیروں پر آ کر لگی۔ وہ قدآور نوجوان پابریدہ ہو کر زمین پر گرا اور آن کی آن میں ختم ہو گیا۔ تب اچانک اس نوجوان کا چہرہ لہریں لینے لگا۔ یوں جیسے ساکن پانی میں کنکر پھینکا جائے تو پانی دائرے بنانے لگتا ہے۔ چند لمحوں بعد جب ایلی روتھیس کا چہرہ ساکت ہوا تو میرے منہ سے بے ساختہ ایک چیخ نکل گئی۔

وہ ایڈگر کا چہرہ تھا۔ وہ ایڈگر کا پابریدہ اور خوں آلود بدن تھا۔ خون زیتون کے درخت کو سیراب کر رہا تھا اور طلائی کلہاڑی پر لہو کے دھبے تھے۔

جب میری آنکھ کھلی تو میرا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور میرے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا آسمان پر پو پھٹ رہی تھی۔

☼

دوسرے دن ڈیڑھ بجے کے قریب جب میں ریکارڈنگ روم سے اپنے کمرے کی طرف آئی تو ایڈگر میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں صبح سے کام میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ مجھے اس کا خیال بھی نہیں آیا تھا لیکن اب ایڈگر کو دیکھ کر مجھے نامعلوم سی خوشی ہوئی، اور اس کے ساتھ ہی مجھے رات کے ڈراؤنے خواب یاد آ گئے۔

"جانتی ہو آج کی سب سے اچھی خبر کیا ہے؟" ایڈگر نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بھئی۔ مجھے تو آج صبح سے اپنا ہوش ہی نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"کل شام جب میں یہاں واپس آیا تو معلوم ہوا کہ انفارمیشن کا ایک ٹرینی کیلیفورنیا میں میرا کلاس فیلو رہ چکا ہے میں نے آج کے لیے اس کی گاڑی لے لی ہے۔ دوسری اچھی خبر یہ ہے کہ پیلس میں A Farewell to Arms چل رہی ہے، میں نے اس کی بکنگ کرالی ہے، کھانے سے نمٹ کر گھومیں گے پھر فرسٹ شو دیکھیں گے۔"

'غرض یہ کہ اس لڑکے سے نجات کی کوئی صورت نہیں ہے'. میں نے سوچا۔ "تم نے بلا وجہ فلم کی بکنگ کرالی، اب مجھے اپنے گھر فون کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں فوراً فون کردو اور اپنے گھر والوں سے لمبی چھٹی لے لو۔" اس نے کہا۔

"تمہارا شاید دماغ خراب ہوگیا ہے۔ یہ پاکستان ہے امریکہ نہیں کہ آدھی رات تک میں تمہارے ساتھ گھومتی رہوں۔" میں نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔

"میں تو اب بس دو دن کا مہمان ہوں۔ میرے لیے تم اپنے اصول نہیں توڑ سکتیں؟"

"یہ اصول کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ وہ اپنے آپ کو یوں مہمان کہہ رہا تھا جیسے میں نے اُسے تار بھیج کر بلوایا ہو۔ پھر اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے اس پر رحم سا آ گیا' وہ منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ میں نے ٹیلیفون اپنی طرف گھسیٹا اور گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک بار پھر کولمبس" میں بیٹھے تھے۔ "تم نے 'اے فیرویل ٹو آرمز' اس سے پہلے دیکھی ہے یا نہیں؟" کھانے کے بعد ایڈگر نے کوکا کولا کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"میں اس فلم کو کئی برس پہلے دیکھ چکی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میں آخر میں بہت روئی تھی۔ کیتھرین کی موت کے بعد فریڈرک جب بارش میں بھیگتا ہوا واپس ہوتا ہے تو اس کی بے بسی اور اس کا بے پایاں الم دل کے ٹکڑے کر دیتا ہے۔" میں نے یادوں کو کریدتے ہوئے کہا۔

"یہ میری بہت پسندیدہ فلموں میں سے ایک ہے۔ محض اتفاق ہے کہ آج کل یہ فلم یہاں چل رہی ہے۔ میں نے اس کا پوسٹر دیکھا تو سوچا کہ محاذ پر جانے والا ایک انسان تمہیں اس کے علاوہ بھلا اور کون سی فلم دکھا سکتا ہے۔ شاید اسی طرح تمہیں میری تنہائی اور اذیت کا احساس ہو سکے۔"

"اس کی ضرورت نہ تھی، مجھے تمہاری کیفیات کا اچھی طرح اندازہ ہے، ورنہ میں یہاں تمہارے ساتھ بیٹھی ہوئی نہ ہوتی۔" میں نے کہا۔

ہم "کولمبس" میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ایڈگر بہت اچھی باتیں کرتا تھا۔ دھیمے لہجے میں بہت اچھی باتیں۔ تاریخ سے اُسے عشق تھا' انقلاب فرانس سے وہ بہت متاثر تھا۔ برصغیر کی تاریخ کے بڑے ناموں سے واقف تھا ــــــ اکبر اعظم کا نام بہت عزت سے لیتا تھا۔

"اگر میں ویت نام سے گھر واپس پہنچ گیا تو ہندوستان کا سفر ضرور کروں گا اور فتح پور سیکری جاؤں گا اور سکندرہ بھی۔ مجھے اکبر اعظم کا مدفن دیکھنے کی حسرت ہے۔ تصویروں سے تو مجھے کچھ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کا مدفن اس کے شایانِ شان نہیں۔" اس نے باتوں کے دوران کہا۔

اس شام ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ پھر ہم نے فلم دیکھی۔ ہم فلم دیکھ کر نکلے تو اس کا حُزن ہم دونوں پر مسلط تھا۔

☼

وہ کراچی میں ایڈگر کا تیسرا دن تھا' اس دن میں کونسلیٹ نہ گئی۔ وہ تمام دن میں نے سوتے جاگتے گزارا۔ سوتے میں خواب اور جاگتے میں حقیقتیں۔ دن میں کئی مرتبہ ایڈگر کا فون آیا لیکن میں نے گھر میں سب سے کہہ دیا تھا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے دفتر سے کسی کا فون آئے تو یہ نہ بتایا جائے کہ میں گھر پر موجود ہوں۔

وہ شام میں نے کلاسیکی موسیقی سنتے اور "سدھارت" پڑھتے گزاری۔

☼

چوتھا دن رخصت کا دن تھا۔

ایڈگر دس بجے کے قریب میرے کمرے میں آیا۔ اس وقت وہ یونیفارم میں تھا۔ اسے یونیفارم میں دیکھ کر مجھے عجیب سی تکلیف ہوئی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آیا اور کرسی کھینچ کر میرے مقابل بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کل میرے دفتر نہ آنے کی شکایت کرے گا۔ لیکن اس نے کچھ نہ کہا بس خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا "میرے جانے کا وقت آ پہنچا میں تم سے رخصت ہونے آیا ہوں۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اس سے کیا کہوں، وہ 'امام ضامن' کی اصطلاح سے ناواقف تھا ورنہ میں اس سے کہتی کہ جاؤ میں نے تمہیں امام کی ضامنی میں دیا۔ اس لمحے میری نگاہوں کے سامنے جھلسی ہوئی لاشوں اور روتے ہوئے بچوں اور نابینا عورتوں کی تصویریں گھوم گئیں۔ اور اب ایڈگر ایسی ہی تصویروں کی تعداد میں اضافے کے لیے جا رہا تھا۔ پھر اسے میں امام کی ضامنی میں بھلا کس طرح دے سکتی تھی۔ لیکن میں اسے دعا کے بغیر بھی کس طرح رخصت کرتی۔ جنہیں آپ دوست جانیں ان کی زندگی کے لیے دعا تو دل سے بے ساختہ نکلتی ہے۔ اور تب اس لمحے میں نے جانا کہ انسان کیسے عذاب میں مبتلا ہے۔ اور ناکردہ گناہوں کی سزا پاتا ہے اور اس سزا کا اور عذاب کا خاتمہ نہیں ہے۔

میں اس کے ساتھ پورٹیکو تک آئی۔ "میں تمہارا کرم زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔" اس نے پہلی اور آخری مرتبہ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ تیزی سے مڑا اور لپک کر سیاہ رنگ کی اس لیموزین میں جا بیٹھا جس میں اس کے کئی ساتھی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کار روانہ ہوئی تو اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور پھر فوراً ہی منہ پھیر لیا۔

☼

بوندیں چمپا کی خوشبو پر، کامنی کی رنگت پر اور مٹی کی پیاس پر برس رہی ہیں۔ کمرے کے اندر بھولے بسرے گیتوں کے بول بکھرے ہوئے ہیں۔ مینھ کی بوندیں اور گیتوں کے بول کھرنڈ جمے ہوئے زخموں پر برستے ہیں تو زخم جیسے کھل اٹھتے ہیں۔

بوندیں برس رہی ہیں اور زخموں کے گلاب کھلے ہیں۔ ان گلابوں کی شاخوں پر ابھرے ہوئے نوکیلے کانٹے یاد کی انگلیوں میں چبھتے ہیں تو نہ کچھ سوچنے کو جی چاہتا ہے اور نہ کچھ کرنے کو۔ میں اُلجھ کر میز پر رکھا ہوا "پاکستانی ادب" اٹھاتی ہوں، یہ اس کا "امریکی ادب" نمبر ہے۔ میں اس کی ورق گردانی کرنے لگتی ہوں۔ میں صفحوں پر صفحے پلٹتی ہوں پھر میری نگاہیں ایک صفحے پر رُک جاتی ہیں۔ یہ ایک بارہ سالہ امریکی بچی باربرا ہائیڈلر کی نظم کا ترجمہ ہے۔

وہ، وہ ایک اشکارا
روپہلا اور سنہری

روپہلا اور سنہری
روپہلے پرندے اڑتے ہیں
سنہرا پانی برستا ہے
دھان لہر کی تال
نئے پانی کے ساتھ بھڑک کر جھلس جاتے ہیں۔

میری نگاہیں اس نظم کی ایک ایک سطر کو میکانکی انداز میں پڑھتی چلی جاتی ہیں، پھر میں آخری سطروں تک پہنچتی ہوں۔

سُن امریکہ، سُن دھیان سے
ہائی پھونگ سے اٹھتی بچوں کی چیخیں
لمبی اور صاف سنائی دیتی ہیں یہ چیخیں

اور میری آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ ابھرتا ہے، میری آنکھوں کے گوشے بھیگ جاتے ہیں۔ ایڈگر اس نظم کو پڑھتا تو بھڑک اٹھتا لیکن اس نے یہ نظم نہیں پڑھی۔ یہ نظم جو ۶۹ء میں امریکہ کے ایک گمنام اور نہایت مختصر تعداد میں شائع ہونے والے رسالے میں چھپی تھی اور پھر وہ پرچا بحق سرکار ضبط ہو گیا تھا۔

"ایڈگر، کاش تم نے یہ نظم پڑھی ہوتی"، میں خواہش کرتی ہوں۔

میری میز کی نچلی دراز میں دوسرے بہت سے خطوط کے ساتھ چند ایئر لیٹر بھی ہیں جو ایڈگر نے مجھے جنوبی ویت نام سے بھیجے تھے۔ اور انہی خطوط کے ساتھ ایک امریکی ایئر لیٹر ہے جو آج سے سات برس پہلے میرے نام آیا تھا۔ میں نے اس خط کو بار بار پڑھا ہے، ایک بار پھر اسے پڑھنے کی خواہش میرا سینہ کھرچنے لگتی ہے۔ میں اٹھ کر اپنی میز کی دراز کھولتی ہوں اور امریکہ سے آنے والا ایئر لیٹر نکال کر پڑھتی ہوں۔

میری بچی!

تم مجھے نہیں جانتیں لیکن میں اپنے بیٹے کے خطوط میں تمہارا ذکر بار بار پڑھ چکی ہوں۔ تم نے تنہائی کے چند عذابناک دنوں میں اس کا دکھ بٹایا تھا اور تمہارے خطوں سے اسے بہت تسکین ہوتی تھی۔ وہ اپنے ہر خط میں تمہیں نہایت محبت اور احترام کے ساتھ یاد کرتا رہا۔

میں تمہیں یہ خط اس لیے لکھ رہی ہوں کہ میرا بیٹا اور تمہارا دوست آج سے ڈیڑھ ماہ پہلے ہائی پھونگ میں ختم ہوا۔ ایڈگر کی خواہش تھی کہ اگر وہ محاذ پر کام آجائے تو تمہیں اس کے انجام کی اطلاع دے دی جائے۔

والدہ ایڈگر

بس اس خط کو جسے گذشتہ سات برس میں نہ جانے کتنی مرتبہ پڑھ چکی ہوں، باربرا ہانیڈلا کی نظم کے درمیان رکھ دیتی ہوں۔

صرصرِ بے اماں کے ساتھ

ریت کا فرش ہمارے دائیں اور بائیں جانب بچھا ہے اور اس کے درمیان ناہموار سڑک پر سید انیس شاہ جیلانی کی نئی ٹویوٹا کرولا ہچکولے کھاتی آگے بڑھ رہی ہے۔

میں سوچتی ہوں کہ وقت فرشِ شجر کی مانند پھیلا ہوا ہے اور ہم اس پر سفر کرتے ہیں، پھر ہمیں فنا کے طاق پر رکھ دیا جاتا ہے لیکن وقت سفر نہیں کرتا، وقت بوڑھا نہیں ہوتا، وقت کو موت نہیں آتی۔

میں کھڑکی سے باہر دیکھتی ہوں، جا بجا ریت کے ٹیلے سورج کی روشنی میں چمک رہے ہیں۔ گھوڑوں پر سوار چند نوجوان ریت اڑاتے ہوئے ہمارے پہلو سے گزر گئے ہیں۔ کار میں لگے ہوئے کیسٹ ٹیپ ریکارڈر پر خان صاحب عبدالکریم خان بھیرویں الاپ رہے ہیں۔ جمنا کے تیر، گوکل ڈھونڈی، بندرابن ڈھونڈی، جمنا کے تیر، اس آواز کی اداسی میرے وجود کے دور افتادہ گوشوں پر سایہ کر رہی ہے۔ لہروں کے شور میں اسی آواز کی بازگشت ہے اور ہوا کی سنسناہٹ انہی الفاظ کو دہراتی ہے۔ گوکل ڈھونڈی، بندرابن ڈھونڈی، جمنا کے تیر۔

میری نظر زرد رنگ کی ایک کار پر پڑتی ہے جو ریت میں پھنسی ہوئی ہے۔ کئی

نوجوان چہلیں کرتے ہوئے پہیوں کے آس پاس سے ریت ہٹا رہے ہیں۔ ہماری گاڑی آگے بڑھ جاتی ہے۔ میں گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھتی ہوں۔ اردگرد کام کرتے ہوئے چند مزدور انھیں ہاتھوں سے ریت ہٹاتے دیکھ کر اپنے پھاوڑے لیے آگے بڑھے ہیں اور تیزی سے ریت ہٹانے لگے ہیں۔

کوئی سخت چیز میرے پہلو میں چبھتی ہے۔ میں اُسے ہٹانا چاہتی ہوں تو میرے ہاتھ کسی کتاب سے الجھتے ہیں، میں اُسے اٹھاتی ہوں۔ یہ گہری سبز جلد کی ایک ضخیم بیاض ہے۔ پہلے صفحے پر انیس شاہ کی موتیوں جیسی سجل اور دلکش تحریر میں ان کا پورا نام لکھا ہے اور اس کے نیچے 'حیرت شملوی اکادمی' اور "محمد آباد۔ رحیم یار خاں" کا نام تحریر ہے۔ میں صفحے پلٹتی ہوں نامور لوگوں کے لکھے ہوئے حروف، یہ مولانا غلام رسول مہر کی اور یہ رئیس احمد جعفری کی تحریر ہے، اس صفحے پر جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے۔ یہ احسان دانش کی نگارش ہے۔ ورق پر ورق الٹتے چلے جاتے ہیں اور ناموں پر نام گزر رہے ہیں۔ ان سب لوگوں کی تحریریں جن سے اس شخص کی دوستی ہے اور جن سے محبت کی اس نے بہت قیمت دی ہے۔

مجھے انیس شاہ کے ذاتی کتب خانے 'مبارک لائبریری' کی نادر کتابوں، مخطوطوں اور ادیبوں اور شاعروں کے بے شمار مکتوبات کا خیال آرہا ہے۔ یہ شخص جو کاتبِ تقدیر سے اپنے نصیب میں 'جاگیرداری' لکھوا کر لایا تھا اور مزاج شاعرانہ اور دانش ورانہ پایا تھا تو یہ اپنے ماحول میں کس قدر تنہا اور کتنا بے آرام ہوگا۔

انیس شاہ کی ذات میں مجھے ہر لمحہ ایک پشتینی جاگیردار اور گمنام ادیب کے درمیان کی کشمکش نظر آتی ہے۔ ان کی ادب دوستی اور علم نوازی نے ان کی جاگیرداری کو ہڑپ کیا اور ان کی جاگیرداری نے ان کے اندر کے ادیب کو بے دعویٰ رکھا۔ ہر لمحہ ادب کے مسائل میں گم اور ہر ساعت اچھی کتابوں اور نادر مخطوطوں کی تلاش میں سرگرداں۔ اس شخص کی زندگی کے تضادات، اس کی زخمی روح اور بے چین ذہن نے مجھے ہمیشہ بہت ملول کیا ہے۔

میں بیاض بند کر کے اپنے دائیں جانب دیکھتی ہوں جہاں ایک خاصا بڑا بحری جہاز سر اٹھائے کھڑا ہے۔ اب ہم اس سے خاصے قریب ہو گئے ہیں۔ دُور سے یہ کس قدر مختصر نظر آ رہا تھا۔ جہاز کی پیشانی پر لکھا ہوا نام Two Rivers صاف پڑھا جا رہا ہے۔ نام کے نیچے شرقِ اوسط کے جگمگاتے ہوئے شہر بیروت کا نام ہے۔

میں اس جہاز کو دیکھنے لگتی ہوں جو نہ جانے کس طرح بھٹک کر اس سمت آ نکلا، پھر طوفانی لہروں نے اسے خشکی پر لا پھینکا اور اب یہ کئی ماہ سے ریت میں پھنسا کھڑا ہے ان دنوں شہر والوں نے اس کی زیارت کو ایک مشغلہ بنا لیا ہے۔ چاند کی چڑھتی تاریخوں میں اس کے پہلو پانی میں ڈوبے رہتے ہیں لیکن ان دنوں چاند کی آخری تاریخیں ہیں اور سمندر تھکا ہوا ہے اور دُور دُور تک پھیلی ہوئی ریت کے لب خشک ہیں۔ انیس شاہ گاڑی کو ریتیلی ڈھلان کی طرف لے جا رہے ہیں۔

"ارے بھئی گاڑی کہیں پھنس نہ جائے"، میں پریشان ہو کر کہتی ہوں۔

انیس شاہ اپنی گھنی مونچھوں کے سائے میں مسکراتے ہیں اور گاڑی آہستہ آہستہ پھسلتی ہوئی ریت پر جا کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں اور بہت سی کاریں اور اسکوٹریں کھڑی ہیں، لوگ کاروں سے اتر کر ٹہل رہے ہیں۔ کچھ لوگ کیمرے لائے ہیں اور 'کلک' کی آواز کے ساتھ جہاز کے پس منظر میں دوستوں اور عزیزوں کی شبیہیں محفوظ کر رہے ہیں۔ فانی انسان نے اپنے وجود کو آئندہ زمانوں تک محفوظ کرنے کے لیے بہت سے طریقے اختیار کیے ہیں۔ یہ سب لوگ چند برس میں ختم ہو جائیں گے لیکن اپنے بعد موجود رہنے کی خواہش تصویروں کی شکل میں باقی رہے گی۔

میں ذہن میں کنکھجوروں کی طرح رینگتے ہوئے خیالات کو جھٹک کر نیچے اترتی ہوں۔ انیس شاہ تیز تیز چلتے ہوئے جاتے ہیں اور جہاز کے زنگ آلود پہلو کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ محمد شاہ جہاز سے زیادہ جہاز کو دیکھنے والی لڑکیوں میں مصروف

ہے اور انیس شاہ کے یار جانی اچھو میاں کو جہاز سے کوئی دلچسپی نہیں، وہ اور سومرو بے تعلقی سے ریت پر ٹہل رہے ہیں، سومرو اور اچھو میاں کے درمیان سرائیکی میں کوئی بحث ہو رہی ہے۔

جہاز کی ریلنگ سے ٹکے ہوئے کئی لوگ ہمارا تماشا دیکھ رہے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے ہم اس جہاز کو تماشا سمجھ کر دیکھنے آئے ہیں۔ یہ عملے کے لوگ ہیں جو ہمہ وقت جہاز پر رہتے ہیں اور جہاز کے نکالے جانے کے منتظر ہیں۔ جہاز کی آہنی سیڑھی کے ساتھ ہی بہت موٹے رسّے کی ایک پرانی اور خاصی گھسی ہوئی سیڑھی ہوا کے ساتھ جھول رہی ہے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک نوجوان جو چہرے مُہرے سے لبنانی یا اُردنی معلوم ہوتا ہے، رسّی کی اس سیڑھی پر پیر رکھتا ہے اور جھولتا ہوا نیچے آجاتا ہے۔ اس کی نگاہ اُن لڑکیوں پر جمی ہوئی ہے جو ایک مرسڈیز کار سے اُتر رہی ہیں۔ وہ نوجوان اپنی بدرنگ جینز کی جیب میں ہاتھ ڈال کر 'ڈن ہل' کا پیکیٹ نکالتا ہے، ایک سگرٹ سلگاتا ہے اور ان لڑکیوں کی طرف بڑھتا ہے۔ اُن کے قریب پہنچ کر وہ ان سے کچھ کہتا ہے تو اُن میں سے ایک دلکش لڑکی زور سے ہنستی ہے پھر وہ سب لڑکیاں اس سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔ وہ اُنھیں جہاز کی طرف اشارہ کر کے کچھ بتا رہا ہے۔

میں ریتیلی ڈھلان کے کنارے پڑے ہوئے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ جاتی ہوں۔ انیس شاہ نے اچھو میاں اور سومرو کو آواز دے کو اپنی طرف بلایا ہے اور اب وہ ان کی تصویریں کھینچنے میں مصروف ہیں۔ میں خالی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہوں، باہر کتنی رونق ہے لیکن اندر کی ویرانی کا بھلا کیا علاج۔ میں جُھک کر ریت پر شہادت کی انگلی سے لکھتی ہوں 'یا دِ یارِ مہرباں آید ہمی'، چند لمحوں تک اپنے لکھے کو دیکھتی رہتی ہوں اور پھر ریت پر لکھے ہوئے حروف کو

بہ یک جنبش انگشت مٹا دیتی ہوں۔ لفظ ریت میں مل جاتے ہیں اور نابود ہو جاتے ہیں۔ جس طرح انسان مٹی میں مل جاتا ہے اور معدوم ہو جاتا ہے۔ ہوا ریت کے ذرّوں کو اپنے دامن میں سمیٹے چکراتی پھر رہی ہے اور یاد کے بگولے میرے ذہن میں رقصاں ہیں۔

"آپ کا بھی جواب نہیں، یہیں بیٹھی رہ گئیں، اچھا اب اٹھیے، کچھ کھانے پینے کا سلسلہ بھی ہونا چاہیے۔" انیس شاہ مجھ سے مخاطب ہیں، ان کا کیمرا لمحوں کو مقید کر کے ان کے شانے پر جھول رہا ہے۔

اب میں انھیں کیسے بتاؤں کہ اس جہاز کو دیکھ کر مجھے کتنی بہت سی اور کیسی سرّیت آمیز باتیں یاد آ رہی ہیں۔ وہ باتیں جنھیں میں نے اپنے بچپن میں سنا اور میرے باپ نے اپنے بچپن میں۔ ماضی کی وہ داستانیں جنھیں کسی مقدس امانت کی طرح انھوں نے مجھے منتقل کر دیا تھا اور یہ سلسلہ ہمارے خاندان میں جانے کب سے چلا آ رہا تھا۔

"شاہ جی، میرا تو ابھی یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہ رہا، مجھے کچھ دیر یہاں چھوڑ دیجیے، واپسی میں لے لیجیے گا۔" میں ان سے کہتی ہوں۔

"صاحب آپ بھی خوب ہیں، یعنی اس ویرانے میں آپ کو تنہا چھوڑ کر ہم چلے جائیں، سبحان اللہ کیا کہنے ہیں آپ کے۔" وہ تیکھے لہجے میں کہتے ہیں۔

"اچھا تو پھر اپنا یہ ملازم یہاں چھوڑ جائیں۔" میں ان کے ڈرائیور کی طرف اشارہ کرتی ہوں جسے وہ محمد آباد سے اپنے ساتھ لائے ہیں۔ وہ چند لمحوں تک کچھ سوچتے ہیں پھر محراب خان کو اشارے سے پاس بلا کر کچھ کہتے ہیں، وہ سر ہلاتا ہے اور مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو جاتا ہے۔

"واپسی میں ذرا دیر ہو جائے گی، میں ان لوگوں کو ڈرا جم کار اور سپلے لینڈ بھی لے جاؤں گا، ذرا سیر تو کرا دوں۔ اچھا یہ بتائیے کہ آپ کے لیے کیا لے کر آؤں؟" انیس شاہ

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھتے ہیں.

"کچھ لانے کی ضرورت نہیں، بس خود واپس آجائیے گا."

میرا جواب سُن کر وہ مسکراتے ہیں اور گاڑی آگے بڑھ جاتی ہے.

میں گہرا سانس لیتی ہوں، کبھی کبھی تنہا ہونے کے باوجود آشنا چہروں سے منہ چھپا لینے کو جی چاہتا ہے، یہ بھی ایک ایسا ہی لمحہ ہے. دن کے آثار ڈوبتے سورج کی روشنی میں چھُپ رہے ہیں. میں اس جہاز کو دیکھتی ہوں جو نہ جانے کن شہروں کو جانے کے لیے نکلا تھا لیکن اب ریت کی دلدل میں گھٹنوں گھٹنوں دھنسا کھڑا ہے. جہاز کے حاشیوں پر اِدھر اُدھر لوگ چلتے پھرتے نظر آرہے ہیں، اس کے باوجود اُس پر عجیب سی آسیب زدگی ہے، جیسے اس میں کوئی رہتا ہی نہ ہو. اُس کے چہرے پر گہرا حزن اور اداسی ہے، وہی اداسی جو گلے سے بچھڑی ہوئی بھیڑ کے چہرے پر ہوتی ہے.

شاید یہ میری نظر کا فتور ہو لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی نے ساحل پر بھی حزن اور اداسی کی لکیر کھینچ دی ہے. اس ساحل میں اور دیبل میں کیسی عجیب سی مماثلت ہے. وہاں بھی پتھر کی ایک نصف نمودار دیوار ہے جس نے شہر کو اپنی پناہ میں لینے کی کوشش کی تھی پر شہر کو اور شہر والوں کو پناہ نہیں مل سکی تھی اور یہ بھی ایک دیوار ہے جو اگر وقت کی گرد میں چھُپ جائے اور پھر کسی اور زمانے کی نسلیں اس دیوار کو کھود کر نکالیں تو شاید وہ اسے شہر پناہ جانیں، لیکن یہ دیوار سمندر کا راستہ روکے ہوئے ہے اور وہ دیوار سمندر کی جانب سے آنے والے قزاقوں کا راستہ روکتی تھی.

وہ بھی ایک ایسی ہی اداس اور حزن سے معمور شام تھی. سورج غروب ہونے والا تھا اور میں دیبل (بھنبھور) کے جنوبی دروازے کی سیڑھیوں پر کھڑی تھی. انیس شاہ چلتے چلتے تھک گئے تھے اور دروازے کے قریب ایک اونچی سی ٹیکری پر جا بیٹھے تھے. میں نے اس دروازے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ان جہازوں کا تصور کیا تھا جو

اپنے بادبانوں میں ہوائیں سمیٹے آتے تھے اور دیبل کے گھاٹ پر لگتے تھے اور بے اندازہ سامانِ تجارت کے علاوہ دور افتادہ زمینوں سے آنے والوں کو لے کر آتے تھے۔

اُس شام میں ان سیڑھیوں سے اُتر کر گھاٹ تک گئی اور وہاں پھیلی ہوئی ریت میں یوسف نوبختی کے نقشِ قدم ڈھونڈے لیکن ہوا سارے نقش اڑا کر لے گئی تھی اور وقت نے کسی نشان کی حفاظت نہیں کی تھی۔ ساحل کے قریب نمک کے بے شمار ٹیلوں کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہ سمندر کی آنکھوں کا نمک ہے جو ساحل پر جمع ہو گیا ہے لیکن رات کے اندھیروں میں اور شام کے دھندلکوں میں جو آنسو انسان بہاتے ہیں اور ان آنسوؤں میں جو نمک ہوتا ہے وہ کس ساحل پر جمع ہوتا ہے؟ اس کے ٹیلے کس مقام پر کھڑے ہو کر گنے جا سکتے ہیں؟

ایک کالا تیتر میرے قریب سے بولتا اُڑ گیا تھا اور تب میں نے اس ساحل پر ایک الوداعی نظر ڈالی تھی جہاں صدیوں پہلے میرے جد نے قدم رکھا تھا۔ واپسی پر انیس شاہ قدم قدم پر رُکتے ہوئے اور جھک جھک کر اپنی انگلیوں سے مٹی کریدتے چلے تھے اور جب ہم شیو مندر پہنچے تھے تو انھوں نے مٹھی کھول کر میری طرف کئی چیزیں بڑھا دی تھیں، گہرے سبز رنگ کی چینی کے کسی برتن کے تین چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، صیقل شدہ چینی کا ایک ٹکڑا اور گہرے نیلے رنگ کی چینی کے دو ٹکڑے جن پر کسی پھول کے نامکمل نقش تھے۔ سفید، نیلے اور سبز رنگ کی چینی کے یہ ٹکڑے مختلف برتنوں کا حصہ رہے ہوں گے۔ جانے یہ چیزیں کن گھروں کی زینت ہوں گی، یہ ٹکڑے کس خُم کا، جانے کس پیالے کا جزو ہوں گے، جانے کن حنائی انگلیوں کے ریشمی لمس نے انھیں محسوس کیا ہوگا، جانے کن لبوں نے اس پیالے کو اپنے ہونٹوں سے لگایا ہوگا؟ وہ انگلیاں دھول ہوئیں اور وہ ہونٹ راکھ اور خاک ہوئے اور میں جو انھیں چھو رہی تھی اور دیکھ رہی تھی تو میری انگلیاں بھی خاک میں ملنے والی تھیں اور میری آنکھوں کو بھی حشرات الارض

کی غذا بننا تھا۔

عنکبوتِ وقت کا جالا کائنات کے گرد بُنا گیا ہے اور ہم اس تارِ عنکبوت میں پھنسے پھڑپھڑاتے ہیں۔ وقت سے نجات نہیں اور فنا سے پناہ نہیں۔ پھر میں کیوں ہوں اور میرے جدِّ اعلیٰ بہروز پور ہرمز کیوں تھے اور میرے جد یوسف نوبختی کیوں تھے۔ اور شیز کا آتشکدہ آذرخش کیوں تھا؟

جب ہر چیز کو فنا کا ذائقہ چکھنا ہے تو پھر یہ سب چیزیں کیوں ہیں؟ کیا صرف اس لیے کہ یہ ہمیں اپنی ایک جھلک دکھائیں اور پھر یہ ہماری آنکھوں سے اور ہم ان کے سامنے سے اوجھل ہو جائیں اور اپنے پیچھے حزن کی ایک لکیر چھوڑ جائیں، پھر ہمارے بعد فنا کے راستے پر چلنے والے آئیں اور حزن کی اس مٹتی لکیر کو دیکھیں تو اپنے سروں پر خاک ڈالیں اور اپنے گریبانوں کو چاک کریں اور اپنی آنکھوں سے اشکِ افسوس بہائیں۔ کائنات کی یہ بساط کیا محض اسی لیے بچھائی گئی ہے؟

میں ریت میں اپنے جد کے نقشِ قدم کیا ڈھونڈوں کہ بادِ صرصر نے انہیں مٹا دیا اور ریگستان سے نخلستان کو جانے والا راستہ گُم ہو چکا ہے۔ تمام راستے گم ہو چکے ہیں اور ان راستوں پر چلنے والے فراموش کیے جا چکے ہیں۔ ذکر بیکار ہے اور ذکر لا حاصل ہے۔ سوختگاں کا ذکر کیا، ہاں ذکر سے بھلا کیا ہوتا ہے۔ سوختگاں کا ذکر کیا۔ بس یہ سمجھو کہ وہ گروہ، صرصرِ بے اماں کے ساتھ دست فشاں گزر گئے۔ سوختگاں کا ذکر کیا، دست فشاں گزر گئے۔

افق پر ڈوبتے ہوئے سورج کی آگ بھڑکتی ہے اور آگ گھروں میں، بازاروں میں، آسمانوں میں اور آتشکدوں میں بھڑکتی ہے۔ میرا خاندان گذشتہ ساڑھے تیرہ سو برس سے آتشکدوں کی بجائے مسجدوں میں سجدے گزارتا رہا ہے لیکن کبھی کبھی میرے اندر ایک قدیم روح بیدار ہوتی ہے اور تب میں اس روشن آگ کو دیکھنا چاہتی ہوں جو کبھی نہیں بجھتی۔

میرے شہر کی ایک بارونق سڑک پر سرمئی رنگ کی ایک عمارت ہے، اس عمارت

میں سیاہ دیواروں والا ایک حجرہ ہے اور اس حجرے میں کبھی نہ بجھنے والی یہ آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں سیاہ دیواروں والے اس حجرے میں قدم رکھوں اور اس درخشاں آگ کے سامنے جھک جاؤں، پھر زرتشت بہرام پژدو کی زبان میں کہوں،
یکے تازہ کن قصۂ زرہ تشت، بنظم دری دبخط دُرشت۔

مجھے نہیں معلوم کہ میرے سینے میں آگ کا کون سا درجہ روشن ہے۔ کیا یہ وہ آگ ہے جو آذرخش کے معبد میں بھڑکتی تھی اور 'برزِ سواہ' کہلاتی تھی اور جس کی حضوری کے لیے شہنشاہ پیادہ پا آتے تھے اور جس کے سامنے دوزانو ہو کر وہ اس کی حمد کرتے تھے اور خوشبودار لکڑیوں کی نذر پیش کرتے تھے کہ جب وہ خوشبودار لکڑیاں اس مقدس آگ کا ایندھن بنیں تو روشنی فانی انسانوں کے سینوں کو پاک کر دے۔

یا پھر میرے سینے میں 'دھوفریان' بھڑکتی ہے؟

نہیں، یہ آگ کا چھٹا درجہ ہے، اسے 'آتش بحر' کہتے ہیں۔

آگ کا چھٹا درجہ بھڑکتا ہے۔ صندل، کیسر، عود اور عنبر کی خوشبو پھیل جاتی ہے۔ یاد کا خوشبودار دھواں بل کھاتا ہوا آسمانوں کی طرف بلند ہوتا ہے اور میں اس کی اسیر ہوں، یہ دھواں مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ دھویں کی اس دائرہ نما چادر نے منڈپ کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس منڈپ میں سینے راما Cinerama کا کھیل جاری ہے۔ میرے چاروں طرف چہرے ہیں اور آوازیں ہیں۔ شہر، جنگل اور پہاڑی سلسلے ہیں، جھیلوں میں کنول کھل رہے ہیں۔ سفید پروں والے بگلے ان جھیلوں میں اپنی گلابی چونچیں ڈبوتے ہیں۔ جھرنوں کی گنگناہٹ ہے اور دریاؤں سے مانجھیوں کی آواز بلند ہوتی ہے۔

اور تب یاد کے منڈپ کی دیواروں پہ مگدھ ماں زمردیں دوشالہ اوڑھے، گنگا کو اپنی مانگ میں سجائے، ہاتھوں میں سونے اور گندک کے کنگن، پیروں میں ساردا اور

گھاگھرا کی آلتا پہنے اُبھرتی ہے۔ مگدھ ماں کی تعظیم کرو کہ یہ زوان کی دھرتی ہے۔ گندا پور کے مہا دیرا اور کپل وستو کے شہزادے گوتم کو گیان اسی دھرتی پر ملا ہے۔ یہاں والمیکی نے راماین لکھی ہے اور ودیا پتی نے اپنی کویتائیں گنگنائی ہیں۔ یہاں دنیا کی پہلی جمہوری ریاست ویشالی کے، عظیم نالندہ کے اور راج گریہہ کے کھنڈرات ہیں۔ یہاں بھیم بسار، اجات سترو، چندر گپت موریہ اور اشوک اعظم کے نام کا نقارہ بجتا ہے۔ یہ وہ دھرتی ہے جس کی سیاسی اور مذہبی نوآبادیات ٹکشلا، بامیان، بلخ، قندھار اور لنکا تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اور یہ راجا سہاسترارام کا شہر سہاسارام ہے۔ یہاں حسن خان کا بیٹا اور ابراہیم خان کا پوتا، فرید شیر خان جاہ و جلال کے ساتھ آرام کرتا ہے۔ اس کے عظیم الشان ہشت پہلو مدفن کو چھوتے ہوئے پانی پر کنول تیرتے ہیں۔

پانی مجھے اپنی طرف بلاتا ہے اور کنول اپنی نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہیں۔ شیر خاں کے مدفن کے ساتوں دروازے میرے لیے کھلے ہیں، پر میرے پیر نہیں اٹھتے، مجھے راستہ نظر نہیں آتا۔ اور تب میری بےتاب آواز پانیوں پر سفر کرتی ہے، میری آواز بلندیوں اور پستیوں پر اُڑان بھرتی ہے۔ 'چال چلن موہے من کو بھا وے۔ رنگ ڈھنگ وا اَدِھک سہا وے۔ اس بن دل کو رہے کلیس'۔

کیمور کی پہاڑیاں مجھ سے پوچھتی ہیں 'اے سکھی ساجن؟'

میری زخمی آواز ایک بار پھر اپنے پر کھول کر اڑتی ہے اور شمال کا رُخ کرتی ہے 'نا سکھی دیس۔ نا سکھی دیس'۔

آواز کی بازگشت میرا تعاقب کرتی ہے اور میں وحشت زدہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوتی ہوں، عالم اضطراب میں ٹہلنے لگتی ہوں۔ میری نظر اس تنہا اور اداس جہاز پر پڑتی ہے تو مجھے بے ساختہ دیبل یاد آتا ہے، منصورہ یاد آتا ہے۔

یاد کی منطق نہیں، اس کی کڑیاں اتنی اُلجھی ہوئی اور بکھری ہوئی ہیں کہ

ان کا ملانا محال ہے۔ میں ٹہلتے ٹہلتے خاصا آگے نکل جاتی ہوں، اچانک میری نظر ایک صاحب پر پڑتی ہے جو پریشان حالی کے عالم میں سر جھکائے اِدھر اُدھر کچھ دیکھتے پھر رہے ہیں۔ میرے قدموں کی چاپ سُن کر وہ نگاہیں اٹھاتے ہیں اور مجھے دیکھتے ہیں۔ "کیا آپ نے یہاں کہیں ایک چھوٹی سی سیاہ ڈائری دیکھی ہے؟" وہ معذرت کرتے ہوئے پوچھتے ہیں۔ ان کا لب و لہجہ اِن کے غیر ملکی ہونے کی دلیل ہے۔ یہ صاحب اندازاً اُپنیتالیس پچاس کے پیٹے میں ہوں گے۔ تانبے جیسی رنگت پر آئن اسٹائن کی سی کھچڑی مونچھیں بہت اچھی لگ رہی ہیں، قلموں کے آدھے بال سیاہ ہیں اور آدھے سفید، جانے کس ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔

"جی نہیں، میں نے تو نہیں دیکھی۔" میں جواب دیتی ہوں۔

"اس ڈائری میں میری بہت اہم یادداشتیں ہیں۔" وہ عجب لاچاری سے مجھے بتاتے ہیں۔ ان کے لہجے میں اتنی بے بسی ہے کہ میں بے ساختہ ان کے ساتھ چلنے لگتی ہوں۔ وہ جس راستے سے گزرے تھے، اُسی پر واپس پلٹ رہے ہیں۔ اب ہر طرف اندھیرا پھیلنے لگا ہے جس کی وجہ سے وہ بہت مضطرب ہیں اور تب اچانک میری نگاہ سیاہ رنگ کی کسی چیز پر پڑتی ہے جو ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں ہے۔ میں جُھک کر اسے اٹھاتی ہوں، یہ سیاہ رنگ کی ایک چھوٹی سی ڈائری ہے، اس کی چرمی جلد سے ریت کے ذرّے لپٹ گئے ہیں۔ میں ڈائری ان کی طرف بڑھاتی ہوں۔ اس لمحے ان کی آنکھوں میں جو ممنونیت ہے اس کا بیان شاید ممکن نہیں۔ وہ جوش میں میرا ہاتھ تھام لیتے ہیں اور بار بار میرا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

میں اسی پتھر پر بیٹھ جاتی ہوں جس کی اوٹ سے میں نے وہ ڈائری اٹھائی تھی۔ وہ بھی میرے برابر بیٹھ جاتے ہیں۔ مجھ سے تھوڑی دور پر محراب خان کھڑا ہے اور قدرے بے یقینی سے ہم دونوں کو دیکھ رہا ہے۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ

ایک اجنبی کی اس اچانک بے تکلفی پر اُسے پریشان ہونا چاہیے یا نہیں۔

"میرا نام دکتر حمّاد سلامہ ہے۔" وہ رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "میں یونیسکو سے متعلق ہوں اور موہنجوڈرو کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔ آج جب کسی نے اس جہاز کا ذکر کیا تو میں اسے دیکھنے چلا آیا، وطن سے دور ہو کر وہاں کی معمولی چیزیں بھی بہت اہم محسوس ہوتی ہیں۔" وہ کہتے ہیں۔

"تو گویا آپ کا تعلق لبنان سے ہے؟"

"ہاں میں لبنان کا رہنے والا ہوں اور یہ محض اتفاق ہے کہ دو برس سے وہاں نہیں جا سکا ہوں جب کہ ساری دنیا میں گھومتا پھر رہا ہوں۔ میری تعلیم بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں ہوئی ہے۔" بیروت کا نام لیتے ہوئے ان کے لہجے میں افتخار کی ایک ہلکی سی جھلک موجود ہے۔ "تم نے موہنجوڈرو تو دیکھا ہوگا؟ یہ ایک عظیم الشان تاریخی ورثہ ہے لیکن اسے سیم اور تھور سے شدید خطرہ ہے، مجھے یونیسکو نے اسی سلسلے میں رپورٹ مرتب کرنے کے لیے بھیجا ہے۔" وہ مجھے اپنے بارے میں بتاتے ہیں۔

"جہاں تک عظیم الشان تاریخی ورثے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں آپ بھی کم خوش نصیب نہیں۔" میں انھیں ان کا تاریخی ورثہ یاد دلاتی ہوں۔

"تو گویا تمھیں شہروں کے تاریخی ورثے سے دلچسپی ہے؟" وہ قدرے خوش ہو کر مجھے دیکھتے ہیں۔ "دوسری قدیم بستیوں کی طرح بیروت کا بھی کئی مرتبہ نام بدلا ہے۔ میلادِ مسیح کے قریب یہ شہر Berytus کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور جس طرح آج بیروت کی امریکن یونیورسٹی کا بہت شہرہ ہے، اسی طرح تیسری صدی عیسوی میں یہاں کی جامعۂ قانون دنیا کے تمام علمی حلقوں میں مشہور تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یہ شہر علمی لحاظ سے ایتھنز، اسکندریہ اور قیساریہ کا ہم پلہ تھا۔"

وہ باتیں کرتے کرتے کھڑے ہو جاتے ہیں اور میں بھی ان کا ساتھ دیتی ہوں، پھر وہ ٹہلنے لگتے ہیں۔ ٹہلتے ہوئے ان کی نظر ریت پر پڑے ہوئے کینو کے چھلکے پر پڑتی ہے، وہ اُسے ٹھوکر مار کر ہنستے ہیں: "یہ جو تم سنگترے کا چھلکا دیکھ رہی ہو، بیروت اس سے ہزار درجہ بہتر سنگتروں کے لیے گرد و نواح کے علاقے میں مشہور تھا۔ بیروت کی بندرگاہ سے سنگتروں کے ہزاروں ٹوکرے جنیوا، وینس اور دوسرے شہروں کو جاتے تھے۔"

میں جامعۂ قانون اور سنگتروں کے درمیان موجود ربط کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہوں، شاید ڈاکٹر حماد سلامہ نوسٹلجیا کا شکار ہیں، اسی لیے ایک طرف وہ بیروت کے علمی پس منظر پر فخر کر رہے ہیں اور دوسری طرف سنگتروں کی برآمدات پر خوش ہیں۔ میں سوچتی ہوں اور دل ہی دل میں مسکراتی ہوں۔

"پھر جب مسلمانوں نے اسے فتح کیا تو اس کی آبادی کا تناسب بدل دیا۔ ایران سے ہزاروں کی تعداد میں نو مسلم یہاں لائے گئے اور انھیں بیریتوس اور اس کے گرد و نواح میں آباد کیا گیا۔" ڈاکٹر حماد کہتے ہیں اور جیب سے سگرٹ نکالتے ہیں۔

ساڑھے تیرہ سو برس پرانے اس واقعے کا ذکر سن کر میرے اندر ایک ہیجان بپا ہے۔ ریت میں دھنسے ہوئے اس بیروتی جہاز کو دیکھ کر میرے اندر جو کیفیت پیدا ہوئی تھی وہ شدید ہو گئی ہے۔ "جناب، مجھے اس جہاز سے اور بیروت سے اور لبنان سے جو خاص دلچسپی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے جد ان نو مسلموں میں سے ایک تھے جنھیں معاویہ کے حکم پر ایران سے بیریتوس لے جایا گیا تھا۔" میں انھیں بتاتی ہوں۔

ڈاکٹر حماد سگرٹ سلگانا بھول گئے ہیں اور تیز ہوا نے شعلے کی لَو کو کھا لیا ہے، وہ لائٹر ہاتھ میں لیے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ "بہت خوب، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم ماضیٔ بعید سے پوری طرح وابستہ و پیوستہ ہو، مجھے اس وقت واقعی بہت خوشی ہوئی، ورنہ اس زمانے میں نوجوان نسل تو اپنے دادا کا نام یاد رکھنے کی بھی روادار نہیں۔" وہ کہتے ہیں۔

"بات دراصل یوں ہے کہ وہ خاندان جو کتابوں سے اپنا رشتہ استوار رکھتے ہیں، وہ اپنی اصل کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ آج اس جہاز کو دیکھ کر مجھے اپنے جدّ اعلیٰ بہرز پور ہرمز کی یاد آ رہی ہے جو شیز میں شاہانِ ایران کے مخصوص آتشکدے 'آذر خش' کے ایک موبد تھے اور جنھوں نے شیز پر مسلمانوں کے قبضے کے وقت دیگر موبدوں کے ساتھ ہند کی جانب فرار ہونے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش ناکام رہی، ان کے ساتھی مارے گئے اور وہ غلام بنا لیے گئے۔ غلامی سے نجات کا واحد طریقہ مسلمان ہو جانا تھا' سو وہ اسلام لائے اور کچھ عرصے بعد انھیں طیسفون سے بیریتوس لے جایا گیا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ایران کے عظیم ماضی کی یادوں سے کنارہ کشی ان کے لیے ممکن نہ تھی۔ وہ اپنے ساتھ نہ جانے کس طرح اپنی چند کتابیں بیریتوس لے جانے میں کامیاب ہو گئے، وہ ان کتابوں کو چھپ چھپ کر پڑھتے اور ایران کی عظمتِ رفتہ پر گریہ کرتے۔ دُرفشِ کاویانی، نوشیرواں کا شاہی لباس اور فرشِ بہاران کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے ہوا اور عرب فاتحین میں مالِ غنیمت کے طور پر تقسیم ہوا۔ کسی مذہب کو قبول کر لینے سے چشم زدن میں آپ کا کلچر نہیں بدل جاتا اور کسی زمین کو اختیاری یا جبری طور پر ترک کر دینے سے اُس زمین کے ساتھ جذباتی وابستگی کا رشتہ بھی منقطع نہیں ہوتا۔ وہ بہرز پور ہرمز سے فاتک ابن ہرمز ہو گئے تھے لیکن ایرانی کلچر سے اور 'آذر خش' کے عظیم پس منظر سے دستبرداری ان کے بس کی بات نہ تھی اس لیے انھوں نے اور ان کے بیٹوں نے شیعیت، شعوبیت اور تصوف میں پناہ لی۔"

"تم نے کاہے میں پناہ ڈھونڈی ہے؟" وہ اچانک پوچھتے ہیں۔

"مجھے آپ Agnostic جانیں۔ میرے خاندان نے کئی بار تقیہ کیا ہے۔ جب اُموی خلفا کے جاسوس شیعوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے اس وقت میرے اجداد میں سے کئی نے اپنے مسلک کو چھپایا، پھر اس کے بعد جب بھی میرے بزرگوں پر

کوئی بُرا وقت آیا انھوں نے تقیے میں پناہ لی۔ لیکن یوں بھی ہے کہ ہمارے خاندان کے کچھ لوگوں نے حنفی مسلک اختیار کیا، ویسے تصوّف کا ہمارے ہاں بطور خاص غلبہ ہوا اور ہمارے خاندان میں قطار اندر قطار صوفی پیدا ہوئے۔"

"تمھارے خاندان نے بیروت سے کب ہجرت کی؟" وہ پوچھتے ہیں۔

"ہم نے بیرتوس سے بغداد کی راہ لی تھی۔ آٹھویں صدی کا آغاز تھا جب بغداد میں بامیان کے آتشکدۂ نوبہار کے خاندانِ برمک پر قیامت ٹوٹی اور اس خاندان کا حلقۂ خاص بے اساس ہوا، اس حلقے کے کئی لوگ جب فضل اور جعفر سے دوستی کی پاداش میں بُریدہ سر ہوئے تو میرے جد یوسف نوبختی نے بغداد چھوڑا، بصرے کا رُخ کیا اور پھر وہاں سے ایک ایسے سفر پر نکلا جس کا خاتمہ نہیں تھا۔ ہجرت اس کا اختیار نہیں جبر تھی لیکن اب ہجرت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ سو اُس کے سر میں سرزمینِ ہند کا سودا سمایا اور وہ احباب سے گلے مل کر اور عروس البلاد شہر بغداد کی جدائی کا غم لے کر ایک نئی سرزمین کی طرف روانہ ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ ہند ایک ایسی سرزمین تھی جو دُور افتادہ تھی اور جہاں خلیفۂ وقت کے جاسوسوں کے پہنچنے کے امکانات بہت کم تھے۔

"وہ شخص صرف اس توقع میں وہاں سے روانہ ہوا تھا کہ ہند کے کسی گوشے میں بیٹھ کر کتابیں پڑھے گا اور کتابیں لکھے گا اور ایک دن چُپکے سے مر جائے گا کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک اجنبی سرزمین پر گمنام مرجانا آسان تھا اور ہارون الرشید کے پرچم تلے خاندانِ برمک کے جاں نثاروں کا جینا محال۔" میں بولتے بولتے اچانک خاموش ہو جاتی ہوں کیونکہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میری بات ختم ہو گئی ہے یا اب شروع ہوئی ہے۔

"مجھے تمھارا نام تک نہیں معلوم، میں نے پوچھا نہیں اور تم نے بتایا نہیں۔ تم واقعی بہت عجیب ہو، مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں بہت پیچھے لوٹ گیا ہوں، اُس دور میں جس کا ذکر میں کتابوں میں پڑھتا رہا ہوں اور جن کتابوں میں تم جیسے نوجوان نبی

اور علمی بحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ میں تمہارا دکھ اور تمہارے اجداد کا دکھ زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہوں۔ تم میرے نام سے مجھے مسلمان سمجھ رہی ہو گی لیکن میں مسیحی ہوں، رومن کیتھولک فرقے سے میرا تعلق ہے۔ میں جب لبنان میں تھا تو مجھے کبھی اپنے مسلمان ہم وطنوں سے زیادہ مختلف ہونے کا احساس نہیں ہوا لیکن اب جب کہ میں مختلف ملکوں کے مسلمانوں اور مسیحیوں کے ساتھ کام کرتا ہوں تو اکثر ایک بے آرامی سی محسوس ہوتی ہے۔ فلپینی مسلمان میرے عرب نژاد ہونے کے باوجود مجھے پسند نہیں کرتے کیونکہ میں مسیحی ہوں اور یورپی مسیحی مجھے اپنا نہیں جانتے کیونکہ میں عرب نژاد ہوں اور میرا کلچر عرب کی سرزمین سے وابستہ ہے۔ یہ ایک بہت عجیب چکر ہے جو میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا اور کبھی نہیں آئے گا۔" ڈاکٹر حماد کے لہجے میں حزن ہے۔

ہر طرف اندھیرا پھیل گیا ہے، ان کے سگرٹ کی روشنی اندھیرے میں جگنو کی طرح جھلملاتی ہے۔ بہت سے لوگ اب واپس جا رہے ہیں، ان کی گاڑیوں کی روشنیاں جب جلتی ہیں تو اندھیرے میں روشنی کی لکیریں کھنچ جاتی ہیں جو لمحوں بھر بعد معدوم ہو جاتی ہیں۔ ریت میں پھنسا ہوا جہاز اب سیاہ رنگ کا ایک بڑا دھبا بن گیا ہے۔

انیس شاہ اب تک نہیں آئے، میں سوچتی ہوں۔

ڈاکٹر حماد اپنی روشن ڈائل والی گھڑی دیکھتے ہیں اور چونک جاتے ہیں۔ "مجھے بہت دیر ہو گئی، آٹھ بجے مجھے ایک سرکاری ڈنر میں شریک ہونا ہے ورنہ ابھی میں تم سے اور بہت سی باتیں کرتا، میں کل شام تک انٹرکان میں ہوں۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی اگر تم مجھ سے آکر ملو، میرا کمرا نمبر ۲۳۲ ہے۔ اور ہاں ڈائری ڈھونڈنے کے لیے میں تمہارا واقعی بہت ممنون ہوں۔" وہ میرا شانہ تھپتھپاتے ہیں۔

"آپ واپس کس طرح جائیں گے؟" میں پوچھتی ہوں۔

"تم میری فکر نہ کرو، یونیسکو کی گاڑی میرے پاس ہے، ڈرائیور گاڑی میں میرا

منتظر ہے۔" پھر وہ بہت گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہیں، اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس طرف روانہ ہو جاتے ہیں جس طرف ان کی گاڑی کھڑی ہے۔

میں انھیں جاتے ہوئے دیکھتی ہوں، چند قدموں تک مجھے ان کا وجود نظر آتا ہے، پھر وہ ہیولیٰ بنتے ہیں اور اس کے بعد وہ سیاہی میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک گاڑی اسٹارٹ ہوتی ہے اور اس کی ہیڈ لائٹیں گھوم کر میری آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں، اس کی روشنی میں مجھے محراب خان کا چہرہ نظر آتا ہے، پھر دو متحرک روشن لکیریں شہر جانے والی سڑک کا رخ کرتی ہیں اور گم ہو جاتی ہیں۔

میں پلٹ کر دیکھتی ہوں، کچھ دور ایک ٹیلے پر بہت روشنی ہے۔ سرخ، سبز اور زرد بتیاں اندھیرے میں جگ مگ کرتی ہیں۔ 'کچھ جگ مگ جگ مگ ہووت ہے، کوئی اوڑھے چُنریا سُووت ہے'، یہ عبداللہ شاہ غازی کا مزار ہے۔ درگاہ کے در عقیدتمندوں کے لیے کھلے ہیں۔ ایک شخص صدیوں سے منوں مٹی کے نیچے سوتا ہے ـــ وہ سوتا ہے اور اس کے ماننے والے جاگتے ہیں۔ جاگنے والوں کا نصیبہ سوتا ہے اور سونے والا ایسا بخت آور ہے کہ اس کے آستانے کی مٹی بھی لوگوں کی آنکھوں کا سرمہ ہے۔ عقیدت کے، محبّت کے، عشق کے اور سپردگی کے انداز نرالے ہیں۔

میرے سینے میں تشکیک کا جہنّم بھڑکتا ہے، میں اس ٹیلے کو حسرت آمیز نگاہوں سے دیکھتی ہوں، یقین اور ایمان کے تمام در میں نے اپنے آپ پر بند کر رکھے ہیں، میرے سینے میں تاریخ کی مکڑی جالا بُنتی ہے اور میں اس تارِ عنکبوت میں گرفتار ہوں۔

دن۔ مہینے۔ سال۔ صدیاں۔

وہ بھی کوئی ایسی ہی اندھیری رات ہوگی جب ہارون الرشید نے ابو ہاشم مسرور الکبیر کو طلب کیا تھا اور اسے جعفر کا سر لانے کا حکم دیا تھا۔ وہ بھی ایسی ہی اندھیری اور مہیب رات ہوگی جب عجم کا تابندہ ستارہ عرب کی سرزمین پر غروب ہوا اور وہ کیسا

تیرہ و تار دن ہوگا جب آلِ برمک کے فرزند، جعفر کا سر بریدہ بدن ایک ایسے اونٹ پر بغداد روانہ کیا گیا جس پر پالان تک نہ تھا، پھر اس بدن کے ٹکڑے بغداد کے شرقی اور غربی پلوں پر لٹکائے گئے اور اس عالی مرتبت کے سر نے جسر اوسط کو زینت بخشی۔

وقت نے آلِ برمک کو عرش سے فرش پر لا کھڑا کیا اور وقت نے تابندہ پیشانی والے برمکیوں کو ذلیل و رسوا کیا۔ جعفر کے ندیم خاص انس بن ابی شیخ کا سر قلم ہوا، اس کے مصاحبینِ خاص میں سے بیشتر قید ہوئے، جعفر کا مرثیہ لکھنے والے واجب القتل قرار پائے۔ "واجعفراہ۔ واسیداہ" کا نعرہ بلند کرنے والے ابراہیم بن عثمان بن نہیک کے سر کا بوجھ خلیفۂ وقت کے حکمِ عالی سے ہلکا ہوا۔

اس عالمِ دار و گیر میں یوسف نوبختی نے جب ہجرت کا خیال باندھا تو اس کے ذہن میں پہلا نام ہند کا آیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہند ایک دور افتادہ سرزمین تھا اور دوسری یہ تھی کہ یوسف نوبختی نے ہندیوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اس کے خاندان کے مردِ بزرگ نوبخت فارسی اور ابنِ نوبخت کے حلقۂ خاص میں کنکہ ایسا جوتشی، مانک ایسا وید، ابوضلع سندھی اور ابوعطا سندھی ایسے شاعر تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب عباسی دربار میں برہم گپت کی کتاب برہم سدھانت کا ڈنکا بجتا تھا۔ پنچ تنتر کتھا کی کہانیاں عربی میں ترجمہ ہو چکی تھیں اور ان کہانیوں کے انداز پر عرب داستاں گو حکایتیں مرتب کر رہے تھے۔ دربار میں بدھ مذہب کے اعتقادات کا چرچا تھا۔ کپل وستو کے شہزادے گوتم کے اساطیری حالاتِ زندگی اور سرانذیپ کے بھکشو بلوہر کی نصیحت آموز کہانیوں کا ترجمہ بلوہر و بوذاسف کے نام سے ہو چکا تھا۔ شاید یوسف نوبختی کو بھی تناسخ کا نظریہ اپنی طرف کھینچتا ہو اور شاید پنچ تنتر کتھا کی بعض کہانیوں کا یہ مرکزی خیال اس کے دل کو لبھاتا ہو کہ انسان اس عالمِ فانی میں محض ایک مرتبہ نہیں آتا، اپنے اعمال کے مطابق وہ بار بار جنم لیتا ہے۔

یوسف نوبختی اس عہد کے دوسرے عجمی نوجوانوں کی طرح روشن خیال اور تصوریت پسند تھا۔ اس کی انہی صفات نے اُسے جعفر برمکی کے قرب سے سرفراز کیا تھا۔ جعفر کی محفلوں میں ہی اس کی ملاقات ابو ضلع سندھی سے ہوئی تھی اور اس نے کئی بار ابو ضلع سندھی سے وہ قصیدہ سُنا تھا جس میں اُس نے ہندوستان کی مدح کی تھی اور کہا تھا کہ 'میری جان کی قسم! یہ وہ سرزمین ہے کہ جب اس میں پانی برستا ہے تو دودھ، موتی اور یاقوت اس سے اُگتے ہیں'۔

ہند سے آنے والے یہ شاعر، جوتشی اور جادوگر کیسے عجیب لوگ تھے۔ انھوں نے بغداد کی علمی دنیا میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ یہ اپنے ساتھ ارقام ہندیہ لائے تھے اور ان کی زیچ نے عربوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ویدوں کی بغداد اور اس کے اطراف و اکناف میں دھوم تھی۔ خلیفۂ وقت اور شہزادے ان کے معترف اور ان کے مریض تھے۔

یوسف نوبختی ایران کے بعد ہند کی عظمت کا قائل تھا۔ پس جب اس نے بغداد سے ہجرت کی ٹھانی تو اپنے سندھی دوستوں سے ہند جانے کا مشورہ کیا۔ ابو ضلع سندھی نے اسے یقین دلایا کہ اگر ایک مرتبہ وہ بعافیت دیبل پہنچ گیا تو پھر خلیفۂ وقت کے ہاتھ اس تک بمشکل ہی پہنچیں گے۔ دیبل ایک عظیم الشان برعظیم کا دروازہ تھا اور اس دروازے سے پھوٹنے والے تمام راستے پُرسکون بستیوں اور خوبصورت شہروں کو جاتے تھے۔

مجھے یقین ہے کہ وہ ایسی ہی کوئی رات ہوگی جب یوسف نوبختی نے ہند کی سرزمین پر اندھیرے سے پہلی مرتبہ ملاقات کی ہوگی۔ گھاٹ پر اتر کر اس نے شہر پناہ کے دروازے کا رُخ کیا ہوگا اور راستہ چلنے والوں سے پوچھتے پوچھتے وہ کسی قریبی سرائے میں پہنچا ہوگا، وہاں چراغ کی ٹمٹماتی روشنی میں یوسف نوبختی نے اپنی کمر کھولی ہوگی۔ پانی سے اپنا گرد آلود اور تھکا ہوا چہرہ دھویا ہوگا اور اپنے بال اس پانی سے بھگوئے ہوں گے کہ تازہ دم ہو سکے اور تب اونٹنی کے دودھ میں کسی نے اسے کھجوریں ڈال کر دی ہوں گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس

نے بصرے کے بازار سے زادِ راہ کے طور پر جو کھجوریں خریدی تھیں ان میں سے کچھ اُس کی خرجین میں پڑی رہ گئی ہوں اور تب اس نوجوان نے جسے جعفر برمکی کا قرب حاصل تھا اور جس کی زندگی ایرانی قالینوں پر آرام کرتے، ریشم و کمخواب کا لباس پہنتے، سونے اور چاندی کے ظروف میں کھاتے اور شب و روز علمی بحثیں کرتے گزری تھی، ہاں اسی یوسف نوبختی نے لکڑی کے پیالے میں ملنے والے اونٹنی کے دودھ اور خشک کھجوروں کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا ہو گا اور گھاس کے بستر کو نرم و گداز توشک کے برابر جانا ہو گا۔

امیر المومنین ہارون الرشید کے 'خزانۃ الحکمت' کے نگران ابوسہل فضل نوبختی کے عم زاد یوسف نوبختی کے لیے ہند کی سرزمین پر وہ پہلی رات کیسی عجیب اور کتنی مہیب رات ہو گی۔ وہ رات جو اس کے لیے امیر المومنین کے غیظ و غضب سے محفوظ و مامون رہنے کا پیغام لائی تھی اور اسی رات سے دیارِ غیر میں صعوبتوں اور کلفتوں کا نیا دور شروع ہوا تھا۔ نئے لوگ، نئی زبان، نئی رسمیں، نئے رواج۔

شیز کے آتش کدۂ آذرخش سے بیر تیوس اور بغداد اور پھر دیبل۔ اس کے جد نے اپنے ساتھی موبدوں کے ساتھ ہند کی سرزمین میں پناہ چاہی تھی پر پناہ نہیں ملی تھی اور اب ڈیڑھ سو برس بعد اس نے بھی سرزمینِ ہند کو اپنی پناہ گاہ جانا تھا۔ اور اس رات یوسف نوبختی نے اپنے آپ کو اور اپنی اولادوں اور ان کی اولادوں کو ہندوستان جنّت نشان کی پناہ میں دے دیا لیکن اے وقت تجھ سے پناہ کہاں ہے؟ اے وقت ہماری ہجرتوں کا خاتمہ، کب، کہاں اور کس سرزمیں میں ہے؟

'تذکرۂ دودمانِ نوبخت' کے ورق میری نگاہوں کے سامنے پلٹتے چلے جاتے ہیں۔ دن کے بعد دن، مہینے کے بعد مہینے، سال کے بعد سال، اور صدی کے بعد صدی۔

دیبل، منصورہ، ملتان، دلی، سہسرام، رہتاس، پٹنہ اور مونگیر۔

وقت کی انگلیاں ورق الٹ رہی ہیں۔ ناموں پر نام گزرتے جا رہے ہیں۔ یاد کے

منڈپ میں ایک بار پھر سیلنے راما شروع ہو جاتا ہے اور ایک حسینہ کا چہرہ مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔ یہ لڑکی شاید ملک قاف سے تختِ سلیماں پر بیٹھ کر آئی ہے۔ ہرنی جیسی وحشی آنکھیں، ستواں ناک، بیضوی چہرہ، سنہرے رنگ کی تنگ مُہریوں والی گھیر دار شلوار اور اس پر سفید اور مہین اونچی سی کُرتی جس میں سے بدن کا سارا حسن دمکتا نظر آ رہا ہے۔ کُرتی پر سرخ اور سفید دھاریوں والی صدری، صدری کے حاشیوں پر سنہرے رنگ کی بیل ہے۔ سیاہ گھنے بال پشت پر بکھرے ہوئے ہیں۔ کمر میں موتیوں کا پٹکا، دائیں بازو پر بڑا سا زمردیں بازوبند، گلے میں سچے موتیوں کی مالا، پیشانی پر موتیوں کی لڑیاں سجی ہیں اور سر پر موتیوں سے بنی ہوئی ایک بہت چھوٹی سی ٹوپی ہے جو ترچھی رکھی ہے۔ شاید 'کجکلاہی' کا لفظ اسی صورت حال کے لیے ایجاد کیا گیا ہے۔ یہ حُسن یہ سراپا دیکھ کر مجھے بے ساختہ فخرالدین گرگانی کا ایک شعر یاد آتا ہے۔ 'نگارا، سرو قدا، ماہ رُویا، بُتا، زنجیر مُویا، مُشک بُویا'۔

وہ ننھے مُنّے قدم اٹھاتی آگے آتی ہے اور یوں گویا ہوتی ہے۔

یاقوتیہ بلخی میرا نام ہے ___ میں بلخ کے شہزادے ابراہیم بن ادھم کی پر دتی ہوں جس نے شہزادہ گوتم کی طرح تخت چھوڑا، بیوی اور بچّے کی محبت سے منہ موڑا اور لباسِ صوف پہنا۔ بلخ کے شہزادے نے دنیا سے کنارہ کیا لیکن اس کے جواں مرگ بیٹے کی اولاد نے دنیا سے ناتا نہیں توڑا۔ اس کی اولادوں میں سے بیشتر مختلف سلاطین اور حکمرانوں کے درباروں میں باریابی کے لیے نکلے اور انھوں نے اپنے اپنے طور زندگی بسر کی۔ ہند ایک ایسی سرزمین تھا جہاں مغل ایک نئے اور طاقتور حکمراں خاندان کے طور پر اُبھر رہے تھے۔ اس لیے میرے باپ نے اپنے بھائی بھتیجوں سمیت سرزمینِ ہند کا رُخ کیا اور خلد آشیانی حضرت بابر گورگانی کی خدمت میں حاضری دی، اعلیٰ حضرت نے ہمارے خاندان کے حسب نسب، ہمارے خانوادے کی علمی فضیلت اور ہمارے سپاہیانہ جوہر کو نظر میں رکھتے ہوئے سب لوگوں کو عہدوں، جاگیروں اور خلعتوں سے نوازا، پھر اعلیٰ حضرت شہنشاہ بابر، راہی ملکِ عدم

ہوئے اور زمامِ سلطنت اعلیٰ حضرت شہنشاہ ہمایوں کے ہاتھوں میں آئی۔
اس کے کچھ ہی دنوں بعد افاغنہ نے سر اٹھایا اور سہسرام کے جاگیر دار حسن خان کے بیٹے فرید خان کو اپنی سلطنت قائم کرنے کا خیال آیا اور وہ ظلِ سبحانی شہنشاہ ہمایوں کے خلاف صف آرا ہوا۔
رہتاس کا قلعہ جب شیر خانی افواج نے فتح کیا تو میں اپنی والدہ کے ساتھ اپنے کوکہ احمد جلال خان کی حویلی میں مقیم تھی۔ کوکہ احمد جلال کے تعلقات وزیر چورامن سے بہت اچھے تھے اور چورامن کو شیر خان سے دلی تعلق تھا اس لیے کوکہ احمد جلال کی حویلی شیر خانی افواج کی دستبرد سے محفوظ رہی۔
تقدیر کبھی کبھی عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ کوکہ احمد جلال کی حویلی کے فوراً بعد جنگل شروع ہو جاتا تھا اس لیے ہم اکثر سیر و تفریح کے لیے یا پرندوں کے شکار کے لیے جنگل کا رُخ کرتے۔ سننے والے اب دل تھام کر بیٹھیں کہ اصل قصّہ یہاں سے شروع ہوتا ہے۔
وہ موسمِ بہار کی ایک شام تھی، پھولوں کی خوشبو سے بوجھل اور آشیانوں کو لوٹتے ہوئے پرندوں کی چہکار سے گونجتی ہوئی۔ میں کوکہ احمد جلال کی بیگم اور چند کنیزوں کے ساتھ حسبِ معمول جنگل کی سیر کو نکلی تھی۔ ہوا ہمارے چہروں پر پڑے ہوئے نقاب اُڑا رہی تھی اور ہماری گھوڑیاں سہج سہج گھنے جنگل کے تنگ اور کچے راستے پر قدم رکھ رہی تھیں۔ میں نے لگامیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں اور جنگل کی خوشبو اور اس کے جادو سے لطف اندوز ہوتی سب سے پیچھے چل رہی تھی۔ کوکہ احمد جلال کی بیوی نے کئی مرتبہ مجھ سے رفتار بڑھانے کو کہا لیکن میں جنگل کے سحر میں اسیر تھی اس لیے میں نے کچھ نہ سُنا، پھر جانے کس طرح میری گھوڑی سامنے کی بجائے پگڈنڈی سے پھوٹنے والی ایک دوسری پگڈنڈی پر مڑ گئی۔ میں اپنے خیالوں میں گم چلتی رہی اور تب اچانک مجھے صبا رفتار گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔ لمحوں

کا جادو ٹوٹ گیا۔ میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اگر یہ وحشی افاغنہ میں سے کوئی ہوا تو؟

اتنی دیر میں سوار میرے سامنے پہنچ چکا تھا۔ اس نے تنگ راستے پر مجھے دیکھ کر اپنے رہوار کی باگیں کھینچیں اور کھینچتا ہی چلا گیا، اب ہم ایک دوسرے کے مقابل تھے۔

ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور عالمِ حیرت میں تھے۔ اس لمحے میری عمر بائیس برس کے لگ بھگ تھی اور میں نے بہت سے مرد دیکھے تھے۔ اپنے سگے بھائی، اپنا کوکہ، اپنے عم زاد، اس کے علاوہ میں نے چلمنوں کے پیچھے سے اور نقاب کی اوٹ سے بہت سے مغل، ترک اور راجپوت سرداروں کو دیکھا تھا اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ میں نے اپنے شوہر خان ناصر الدین عالی کے ساتھ دو برس گزارے تھے، اور خان ناصر الدین نہ صرف یہ کہ ظلِ سبحانی کی افواج میں پنج ہزاری منصب پر فائز تھا بلکہ اس جیسے خوش قامت جوانِ رعنا اور عاشق شوہر عورتوں کو ذرا کم نصیب ہوتے ہیں۔

لیکن اُس لمحے میں جانے کیا بات تھی، شاید یہ سب تقدیر کا کھیل تھا کہ ہم اپنے اپنے رہواروں پر سوار تصویر بنے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ میں نے اسے آگے جانے کا راستہ نہ دیا، میں نے اپنا رہوار آگے نہ بڑھایا۔ ہوا میرا نقاب اُڑاتی رہی اور جنگل پرندوں کی آواز سے گونجتا رہا اور ہمارا وجود پھولوں کی خوشبو سے سرشار ہوتا رہا۔ اُس نے مجھ سے کچھ نہ کہا، کچھ نہ پوچھا۔ میں نے بھی اسے یہ نہ بتایا کہ احمد جلال خاں میرا کوکہ ہے اور میں نے اُسے یہ بھی نہ بتایا کہ میرا نام یاقوتیہ بلخی ہے اور میں نے اُسے یہ بھی نہیں بتایا کہ میں خان ناصر الدین عالی کے گھر کی عزت ہوں۔ ہم عورتیں جب اپنا دل ہارتی ہیں تو بولنا بھول جاتی ہیں، بس چُپ رہتی ہیں، سو میں بھی چُپ رہی۔

پھر میں نے دوسری پگڈنڈی کی طرف سے گھوڑوں کی ٹاپ سُنی اور کوکہ احمد جلال کی ایک کنیز کی آواز سُنی جو گھبرائی ہوئی مجھے پُکار رہی تھی۔ میں نے متوحش ہو کر اسے دیکھا، اُس نے اپنے گھوڑے کو چلنے کا اشارہ کیا اور میں نے اُسے راستہ دیا، وہ راستہ ملتے ہی ہوا ہو گیا۔ میں پھر بھی وہیں کھڑی رہی اور اس کا قامت میری نگاہوں میں کھنچا رہا۔

اس کے بعد میں نے کئی بار اپنے حجرے کے دریچے سے اُسے جنگل میں جانے والے راستے پر آتے جاتے دیکھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ جس کی تلاش میں سرگرداں ہے، وہ اس کی راہ اپنے حجرے کے دریچے سے دیکھتی ہے۔ پھر یوں ہوا کہ ہم دوبارہ جنگل میں ملے۔ اس مرتبہ اُس نے مجھ سے کلام کیا اور تب مجھے پہلی مرتبہ اس کا نام معلوم ہوا۔

سعد نوبختی شیرخانی افواج میں سردار تھا اور اُسے شاعری سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی تھی، بلکہ مجھے تو وہ سپاہی کم اور شاعر زیادہ محسوس ہوا۔ یوں بھی شاہی درباروں سے منصب اور جاگیریں حاصل کرنے کے لیے صرف فن سپہ گری میں طاق ہونا کافی نہ تھا۔ شاعری، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، علم کلام اور دیگر علوم پر دسترس ضروری تھی۔ غرض یہ کہ سعد محض اچھا شمشیر زن، شہسوار اور تیر انداز نہ تھا، وہ شاعری میں طاق، راگ راگنیوں سے بخوبی واقف، فلسفیانہ موشگافیوں میں ماہر اور ستاروں کی چال کا شناسا تھا۔

وہ مجھ پر بُری طرح عاشق ہوا تھا اور میں چاہتے ہوئے بھی اُسے یہ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ تقدیر نے ہماری راہ پہلے سے کھوٹی کر رکھی ہے۔ میں یہ جانتی تھی کہ اگر کوکہ احمد جلال کو اس بات کی ہوا بھی لگ گئی تو وہ مجھے بندی خانے میں ڈال دے گا اور سعد کو اپنے شکاری کتوں سے نچوا دے گا۔ پھر میں سوچتی کہ اگر خان ناصرالدین کو خبر ہو گئی تو؟ لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں کچھ بھی نہیں سوچتی تھی، میں صرف اتنی سی بات جانتی تھی کہ اب خان ناصرالدین کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے موت بہتر ہے۔ کیسی دلچسپ بات تھی کہ ابراہیم بن ادہم جیسے عالی مرتبت صوفی کی پردادی ایک اجنبی کے عشق میں دیوانی تھی۔

میں اس سے سب کچھ چھپانا چاہتی تھی لیکن تا کجے۔ چوتھی ملاقات میں جب میں نے اُسے اپنے بارے میں بتایا تو اس کا رنگ مومی کپڑے کی طرح زرد ہو گیا۔ وہ مجھے ایک ٹک دیکھتا رہا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ سعد نے اُس شام جنگل میں پہلی ملاقات سے لے کر چوتھی ملاقات تک نہ جانے کتنے خوبصورت خواب دیکھے ہوں گے، لیکن میرے ایک جملے نے اس کے تمام خوابوں کو اندھا کر دیا تھا۔ اُس دن جب وہ مجھ سے رُخصت ہوا تو اُس کے چہرے کی شادابی رخصت ہو چکی تھی۔

کئی مہینے گزر گئے، پھر خبر آئی کہ خان ناصر الدین عالی مجھے اپنے ہمراہ لے جانے کے لیے رُہتاس پہنچنے والا ہے۔ اگر یہ خبر مجھے پہلے ملی ہوتی تو میں خوشی سے رقص کرنے لگتی لیکن اب یہ خبر مجھے اپنی موت کا فرمان معلوم ہو رہی تھی۔ میں اُن دنوں اور ان راتوں کے بارے میں کیا بتاؤں جو میں نے سعد کے ہجر میں اور خان ناصر الدین کے قرب کے خوف میں بسر کیں۔

پھر وہ رات بھی آئی جب خان ناصر الدین میری خواب گاہ میں تھا۔ وہ میرا عاشق تھا، میری ایک ایک ادا پر اس کی جان جاتی تھی، وہ طویل جُدائی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی سرد مہری کو چھُپانا چاہا اور اپنے ٹھٹھرے ہوئے جذبوں پر مصنوعی گرمجوشی کی نقاب ڈالنی چاہی لیکن عاشق کا دل ایسا آئینہ ہے جس پر گرد کا ایک ذرہ بھی چھُپ نہیں سکتا، خان ناصر الدین نے میری بے التفاتی کو فوراً محسوس کر لیا۔ اس نے ہزار طرح سے میری سرد مہری کا سبب جاننا چاہا اور میں نے ایک ہزار ایک بہانے تراشے۔

اسی طرح کئی دن گزر گئے، پھر مجھے ایک کنیز کے ذریعے سعد کا پیغام ملا، یہ پہلا موقعہ تھا کہ اُس نے کسی کنیز کو پیغامبر بنایا تھا۔ میں اس راز میں کسی تیسرے کی شرکت سے لرز گئی لیکن شاید وہ بھی مجبور تھا، اُسے علم تھا کہ میری رخصت کے دن قریب ہیں اور وہ مجھ سے آخری بار ملنے کے لیے بے تاب تھا۔

دوسرے دن میں نے کوکہ احمد جلال خان کی بیوی سے جنگل کی سیر کو چلنے کی فرمائش

کی، اس دن اُس کی طبیعت قدرے خراب تھی لیکن وہ یہ جانتی تھی کہ اب میں رہتاس
میں چند ہی دن کی مہمان ہوں، اس لیے اس نے مجھ سے کہا کہ میں کنیزوں کو ہمراہ لے جاؤں.
میں تو دل سے یہی چاہتی تھی کہ وہ ساتھ نہ جائے۔

خان ناصر الدین اُس دن صبح سے ہی کہیں گیا ہوا تھا اور رات سے پہلے اُسے
واپس نہیں آنا تھا، میں اُس کی طرف سے مطمئن تھی، سو میں نے سنگھار کیا اور سعد سے
رُخصت ہونے چلی۔ کنیزوں کو چکما دینا کچھ بہت زیادہ مشکل نہ تھا۔ گھنے جنگل میں کھو جانا
کوئی ایسی خاص بات تو نہیں۔

سعد جنگل میں ایک چشمے کے کنارے میرا انتظار کر رہا تھا، اُس نے مجھے دیکھا تو
بے تاب ہو گیا، ہم دونوں جانتے تھے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے، پھر کہاں شیر خان کا
سردار سعد نو بختی اور کہاں ہمایونی افواج کے سردار خان ناصر الدین خان عالی کی بیوی یا تو تیز بیگی۔
ہم دریا کے دو کنارے تھے اور ہم آسمان اور زمین تھے جو کبھی نہیں مل سکتے تھے۔

سننے والوں کو وقت کے جبر اور اس کے ظلم اور اس کی کینہ توزی سے ہمیشہ خوفزدہ
رہنا چاہیے کیونکہ وہ ہمیں چپکے سے اچانک کسی ایسی جگہ گھیر لیتا ہے جہاں سے ہم فرار
نہیں ہو سکتے۔

تو یوں ہوا کہ اُس شام وقت نے مجھ پر اور سعد پر اپنا جال پھینکا اور ہم اس
میں پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ دائمی جدائی کا الم اور زندگی بھر ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکنے
کے عذاب سے ہمارے دل ٹکڑے ٹکڑے تھے۔ ہمارے چہرے آنسوؤں سے تر
تھے اور ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ایک دوسرے میں اس طرح گُم تھے کہ ہمیں
کسی کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔

ہم تو اس وقت چونکے جب خان ناصر الدین ہمارے سر پہ پہنچ گیا۔ میں نے
دہل کر اُسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی اور اس کا چہرہ طیش، نفرت اور غم و غصے

کے ملے جُلے جذبات سے بھیانک ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت کے دو چشمے پھوٹ رہے تھے اور ان کا رُخ میری طرف تھا۔ مَیں سر سے پیر تک کانپ گئی۔ سعد نے آہستگی سے مجھے اپنے سے جُدا کیا اور اپنی شمشیر بے نیام کرلی۔ خان ناصر الدین منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر اپنے گھوڑے سے اُترا اور اب میرے سامنے دو مرد تھے جو میری خاطر ایک دوسرے کا سر قلم کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ خان ناصر الدین جھپٹ کر سعد پر حملہ آور ہوا' سعد نے اس کے وار کو بڑے سلیقے سے اپنی تلوار پر روکا اور پھر دونوں کی تلواریں بجلی کی طرح کوندنے لگیں۔

میں ہار سنگھار کے درخت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی، میری ٹانگوں کا دم نکل چکا تھا اور ذہن سو گیا تھا' پھر میں نے سعد کے شانے سے پھوٹتی ہوئی خون کی دھار دیکھی، خان ناصر الدین کی تلوار نے اس کا شانہ چاٹ لیا تھا۔ لمحے گزرتے رہے، جانے کتنی صدیاں۔ ان دونوں کی تلواریں ایک دوسرے کو چھوتی رہیں۔ خون اُن دونوں کے بدن سے پھوٹتا رہا' بہتا رہا۔ پھر میں نے سعد کو زمین پر گرتے دیکھا' زخموں سے چُور خان ناصر الدین نے اس کے سینے میں تلوار اتار دی اور لڑکھڑا کر خود بھی اس کے برابر گر گیا۔ سعد نے ان لمحوں میں اپنی بوند بوند کرکے بہتی ہوئی زندگی کو مجتمع کیا، پھر وہ اپنے ہاتھوں پر گھسٹتا ہوا ذرا آگے بڑھا' جانے کس طرح اس نے اپنی کمر میں لگا ہوا پیش قبض نکالا اور خان ناصر الدین کی گردن میں پیوست کر دیا۔ خان ناصر الدین کی گردن سے خون کا ایک فوارہ سا پھوٹا اور سعد کا چہرہ اس کے خون سے بھر گیا' سعد نے اپنے رقیب کا خون اپنے چہرے پر مل لیا تھا۔

میری سمجھ میں کبھی نہ آیا کہ دم توڑتے ہوئے سعد میں اتنی بہت سی خواہش زیست کہاں سے آگئی تھی کہ پھر اس نے پلٹ کر میری طرف بڑھنا چاہا اور تب جیسے مجھے ہوش آیا کہ میری آنکھوں کے سامنے کیا قیامت گزر گئی ہے۔ میں نے اسے اپنی آغوش میں لینا چاہا تو اس نے کہا۔ "میرے قریب نہ آؤ' یہاں سے چلی جاؤ۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم، جاؤ چلی جاؤ" اس کی ڈوبتی

ہوئی آواز میں، اس کی ماند پڑتی آنکھوں میں صرف ایک بات تھی، صرف ایک حکم تھا، صرف ایک التجا تھی۔ مرتے مرتے بھی اسے میری عزت عزیز تھی، میرا نام پیارا تھا۔

میں نے اُسے دیکھا پھر میں نے خان ناصرالدین عالی کو دیکھا۔ میں نے ان دو جوانمرگ مردوں کو دیکھا، میں نے سوچا کہ مجھے ان کے چہروں سے خون اور گرد صاف کرنی چاہیے، مجھے ان کے سروں کو اپنے زانو پر رکھنا چاہیے، مجھے ان دونوں کی لاشوں پر گریہ کرنا چاہیے۔ یہ دونوں میرا سہاگ تھے، یہ دونوں میری زندگی تھے۔ پھر میں کس طرح اپنے رہوار پر سوار ہوئی اور کس طرح کوکہ احمد جلال کی کنیزوں تک پہنچی مجھے کچھ یاد نہیں، شاید وہ میں نہیں میری پرچھائیں تھی جس نے اس شام کنیزوں کو تلاش کیا، راہ بھول جانے کا ناٹک رچایا اور ضبط کی آخری سرحدوں پر کھڑے ہو کر حویلی کا رُخ کیا۔

میرے حویلی پہنچنے کے چند گھنٹوں کے بعد خان ناصرالدین کی خون گشتہ لاش حویلی پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ لاش سعد کی بھی مل گئی تھی اور شیر خانی افواج کے حوالے کر دی گئی تھی۔ ہر شخص حیران تھا کہ سعد اور خان ناصرالدین کا جنگل کے اس حصے میں سامنا کس طرح ہوا اور ہوا تو وہ کیا بات تھی کہ جس کی خاطر دونوں اپنی جان سے گئے۔

میں اپنے سہاگ کے سوگ میں تھی اور وقت میری گھات میں تھا۔

مجھے سعد کا پہلا اور آخری پیغام پہنچانے والی کنیز کا ظرف بہت کم تھا وہ اس راز کو اپنے سینے میں دفن نہ کر سکی۔ ایک رات جب وہ کوکہ احمد جلال کی خواب گاہ میں تھی، شب بسری کے ساتھ ہی اس نے خان ناصرالدین عالی کی ہلاکت کا سبب کوکہ کے گوش گزار کیا۔

صبح ہوئی تو کوکہ احمد جلال نے مجھے طلب کیا، میں اس کے سامنے گئی تو وہ اپنے نام کی تصویر بنا ہوا تھا، اس کی آنکھیں سُرخ تھیں اور چہرہ غیظ و غضب سے سیاہ۔ اس نے نہایت درشت لہجے میں مجھ سے سعد کے بارے میں پوچھا، میں اس سے کیا کہتی، سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ یوں بھی میرے کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی، سعد کا عشق میرے چہرے پر تحریر تھا۔ اور پھر یہ بات

بھی تھی کہ میں ان چند مہینوں میں ہی زندگی سے عاجز آچکی تھی۔ سعد نہیں رہا تھا اور زندگی کا اور کائنات کا تمام حُسن اس کے ساتھ رخصت ہو گیا تھا، خان ناصر الدین کی مجرم میں تھی، غلطی محض میری تھی، تصور سراسر میرا تھا، یا پھر یوں ہے کہ قصور میرا نہیں تھا ان لمحوں کا تھا جب ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور دیکھتے رہ گئے تھے، تقدیر سے اور وقت سے بھلا کسے فرار ہے۔

کوکہ احمد جلال نے زہریلی اور نفرت بھری نگاہوں سے چند لمحوں تک مجھے دیکھا اور پھر واپس جانے کا اشارہ کیا، میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ مجھے بندی خانے بھجوانے کی بجائے واپس مجھے میرے حجرے میں کیوں بھیج رہا ہے، وہ مجھے اتنے بڑے اور بھیانک جرم کی سزا کیوں نہیں دیتا۔

میں اپنے حجرے کے دریچے میں کھڑی جنگل کو دیکھتی تھی اور اسی اُدھیڑبُن میں تھی کہ ایک کنیز آئی، اس کے ہاتھوں میں چاندی کی کشتی تھی اور اس میں چاندی کا ایک خوبصورت جڑاؤ پیالہ تھا اور پیالے میں ارغوانی رنگ کا شربت تھا۔ یہ شربت میرے عزیز از جان کوکہ نے بطور خاص میرے لیے بھیجا تھا اور کنیز کے کہنے کے مطابق 'مفرحِ قلب' تھا۔

عذاب ناک زندگی کا انجام اس قدر جلد اور اتنا دلکش، یہ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ میں نے اپنے عزیز از جان کوکہ کا بھیجا ہوا مفرحِ قلب شربت نوش کیا اور اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی۔

وہ آخری جملہ بڑے ڈرامائی انداز میں ادا کرتی ہے، اسٹیج پر کام کرنے والے منجھے ہوئے اداکاروں کی طرح اظہارِ ممنونیت کے لیے اپنا سر خم کرتی ہے اور کسی بچھل پائی کی طرح اچانک غائب ہو جاتی ہے۔

روشنیاں بجھ گئی ہیں، پردے گرا دیے گئے ہیں، اداکار پس پردہ چلے گئے ہیں۔ وقت کی لہروں پر موجود سے معدوم کا رقص کرتے ہوئے۔ پیچھے اور پیچھے، پچاس برس، پانچ سو برس،

پانچ ہزار برس، Big Bang سے بھی پیچھے۔

یا تو تیہ بلخی، سعد نو بختی، بہر در پور ہرمز، یوسف نو بختی، سب چلے گئے ہیں۔ تمام سائے، سارے ہیولے معدوم ہو گئے ہیں۔ ہم تو جیسے یہاں کے تھے ہی نہیں۔ فراق، وصال، موت، زندگی۔ سب رائیگانی ہے۔ تمام ہجرتیں رائیگانی ہیں، عشق کے تمام رحلے رائیگانی ہیں۔ ہجرت اور عشق سے پھوٹنے والے تعصبات اور رقابتیں رائیگانی ہیں، اوّل فنا، آخر فنا۔ ہاتھ سے بیٹھا گھڑے کھلونے، پاؤں سے توڑت جائے۔

اس ناٹک کے بارے میں اور دوسرے تمام ناٹکوں کے بارے میں سامعین اور ناظرین کے تاثرات جانے کیا ہیں؟

لیکن یہ لوگ اپنے سامعین اور ناظرین تو اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ یہاں تو بس میں ہوں اور میری پرچھائیں ہے۔ ریت میں دھنسا ہوا جہاز ہے اور اس کی پرچھائیں ہے۔ ہم دونوں اور ہماری پرچھائیاں ایک دوسرے سے کیسی مماثلت رکھتی ہیں۔ میں بھی ایک بھٹکا ہوا جہاز ہوں جو اپنے گھر کا راستہ بھول کر اپنے وجود کی بے جہتی میں دھنس گیا ہے اور جس طرح لوگ اس جہاز کا تماشا دیکھنے آتے ہیں، اسی طرح میں اور مجھ جیسے دوسرے بھی، دوسروں کے لیے ایک تماشا، ایک اعجوبہ ہیں۔

آنکھوں کے دیدبان

رات کی آنکھیں نمناک ہیں اور ان آنکھوں کی نمی شبنم بن کر شیشے کی دیوار پر لکیریں کھینچ رہی ہے۔ یہ لکیریں آپس میں گڈمڈ ہو کر کہیں کشتیاں بن گئی ہیں اور کہیں آبی پرندے۔ کشتیوں اور آبی پرندوں کے اس ہجوم میں کہیں کہیں سمندر جھلک رہا ہے۔ یہ سمندر شفاف دیوار کے اس پار دُور تک سویا ہوا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ سوتا ہوا سمندر کروٹ بدل کر اپنی کہنیوں کے سہارے اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ آج کی رات بھی ایسی ہی رات ہے۔ آج شام ہی سے سمندر اپنی کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن نہ جانے کیا چیز اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔ میں بہت دیر سے یہاں بیٹھی سمندر کو دیکھ رہی ہوں اور آج پر ہی کیا موقوف ہے میں تو ہر شام یہاں آ بیٹھتی ہوں اور اسے دیکھتی رہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ دن ضرور آئے گا جب وہ تمام زنجیریں توڑ کر اٹھ بیٹھے گا اور میرے پاس چلا آئے گا۔ میں ایک ایسی ہی رات کا نہ جانے کتنی راتوں سے انتظار کر رہی ہوں۔ یہ راتیں جو پھیل کر صدیاں بن گئی ہیں اور سمٹی ہیں تو عذاب کا ایک جہنمی لمحہ۔

سمندر میں دُور بہت دُور کھڑے ہوئے جہازوں پر جو روشنی ہے وہ میری آنکھ دل

یہ الاؤ ہیں جن میں انتظار کے تناور درختوں کی بریدہ شاخیں جل رہی ہیں۔ میں یہ بات جان گئی ہوں کہ میری آنکھیں یہاں ہیں اور روشن الاؤ میں، سمندر کی لہروں میں اور ستاروں کے قلب میں، اور میری یہ تمام آنکھیں جو ان گنت ہیں مجھے شیشے کی اس دیوار کے پیچھے بیٹھا دیکھ رہی ہیں۔

تم نے کبھی انتظار کو انتظار کے مقابل دیکھا ہے؟ اگر نہیں دیکھا تو مجھے دیکھو، میری آنکھوں کو دیکھو جن میں تمہیں اپنی آنکھیں نظر آئیں گی۔ لیکن اگر یہ تمہاری آنکھیں ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میری آنکھیں کہاں ہیں؟ یہ فیصلہ کون کرے گا؟ یہ فیصلہ میں کروں گی یا سمندر؟ میری آنکھوں کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ ریت کے ذرّے کریں گے یا ہوا کے جھونکے؟ یا پھر رات کے وہ آنسو جو کشتیوں اور آبی پرندوں کی شکل میں شیشے کی دیوار پہ بہ رہے ہیں، یہ فیصلہ آخر کون کرے گا؟

میں تمہیں بتاتی ہوں کہ یہ فیصلہ کوئی نہیں کرے گا اس لیے کہ یہاں کون ہے جو دوسروں کے لیے حکم بن سکے۔ یہاں کی ہر شے خود ہی مدعی ہے، خود ہی مدعا علیہ اور خود ہی منصف۔ وجود کی عدالت تنہائی کی عدالت ہے۔

کوئی حتمی اور آخری فیصلہ سننے کے لیے میں حجرۂ ذات میں جھانکتی ہوں تو دیکھتی ہوں کہ سفید محرابوں اور گنبد نما چھت والے اس حجرے میں انسانوں کا ہجوم ہے اور اس ہجوم کے شانوں سے شانے ملائے خداوندوں اور دیوتاؤں کے پرے ہیں اور سب سے آگے اور سب سے الگ خداوندِ خدا ہے جو داناؤں کے کہنے کے مطابق محرکِ اوّل ہے اور انہی کے کہنے کے مطابق خود حرکت نہیں کرتا۔

میں جان لیتی ہوں کہ یہ تنہائی کی عدالت ہے۔ یہ جان کر مجھے بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے، میں اور مجھ ایسے دوسرے کتنے عیار ہیں کہ تنہائی کی عدالت میں بھی ہجوم میں اور حرکت میں ہیں اور دوسری طرف خداوندِ خدا ہے جسے فرض کیا گیا، پھر اپنے آپ پر فضیلت

دی گئی اور محرکِ اوّل قرار دے کر حرکت سے محروم کیا گیا اور اس طرح اُسے یکسر تنہا کر دیا گیا۔

حجرۂ ذات کے فرش پر لمحوں کا ایندھن دہک رہا ہے اور اس کا پرتو وجود کی دیواروں پر عجب سریت آمیز نقوش بناتا اور بگاڑتا ہے۔ دھوئیں کی چادر ہے اور اس پر مدھم سی روشنی کی تحریر ہے۔ روشنی کی یہ تحریر ان شکلوں کو واضح کرتی ہے جو اس گنبد نما چھت میں آویزاں ہیں۔ ان شکلوں کو پہننے والوں میں سے کچھ الٹے لٹک رہے ہیں اور کچھ سیدھے، کچھ نے فرشتوں سے پر مستعار لیے ہیں اور طاقتِ پرواز کی تلاش میں ہیں اور ہاں وہاں بعض دراز داڑھیوں والے بھی ہیں جو اپنے ہاتھوں میں دانائی کے موتی لیے بیٹھے ہیں اور انہیں لوحِ کُل پر ٹانکتے چلے جاتے ہیں۔ لمحوں کے دہکتے ہوئے ایندھن کا پرتو ان شکلوں کو کبھی اجاگر کرتا ہے اور کبھی تمام مناظر دھندلا جاتے ہیں لیکن خداوند خدا کا وجود ان سب سے الگ ہے، ہر منظر سے جُدا۔ اس لمحے مجھے یونانی یاد آتے ہیں کہ وہ مجھ سے اور میرے لوگوں سے زیادہ خدا دوست تھے۔ وہ اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کو اپنی ہی خامیوں اور اپنی ہی خوبیوں کے سانچے میں ڈھالتے تھے اور انہیں تنہا نہیں چھوڑتے تھے۔

میں خداوند خدا کے چہرے پر تنہائی کی اذیت ناک تحریر دیکھتی ہوں اور اس کے اردگرد پھیلے ہوئے مہیب اور تنہا سناٹے کی گونج سنتی ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے سامنے ایک آئینہ رکھ دوں اور اس طرح وہ جس نے کبھی اپنا چہرہ نہیں دیکھا اُس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھے اور اسے اپنی دوسراہت سمجھے اور دوسراہت سے باتیں کرے لیکن جب میں اس کے سامنے آئینہ رکھنا چاہتی ہوں تو دیکھتی ہوں کہ حجرۂ ذات سراب ہے اور اس کی گنبد نما چھت پر بنی ہوئی اشکال بھی محض خیال کا پھیلا ہوا جال ہیں اور حقیقت تو کچھ یوں ہے کہ میرے سامنے شیشے کی دیوار ہے اور اس کے پار سمندر ہے اور تاروں بھرا آسمان ہے اور ریت کے ان گنت ذرے ہیں اور میری پُشت پر پتھر کی دیوار ہے جو ریت کے ان گنت ذرّوں کو سمندر کے پانی سے گوندھ کر بنائی گئی ہے اور

جس پر ستاروں جیسی خنک روشنی دینے والا دودھیا بلب روشن ہے. پتھر کی اس دیوار میں ایک طاق ہے، اس طاق میں ایک گھڑی رکھی ہے جس کے ڈائل کا رنگ سیاہ ہے جس کے ہندسے سنہری رنگ کے ہیں اور ان ہندسوں کا بوسہ لینے والی سوئیاں بھی سنہری ہیں۔

میں یہاں بیٹھ کر سمندر کا انتظار کرتی ہوں تو حرکت کرتی ہوئی یہ سوئیاں سرگوشی کرتی ہیں. ان سرگوشیوں نے مجھے بتایا ہے کہ فراق، وصال کی دوسری جہت ہے اور کائنات میں انتظار کہیں نہیں ہے اور یہ بھی کہ وقت لامحدود ہے اور اس کے ساتھ ہی محدود بھی کیونکہ وہ کائنات کی مانند ایک دائرہ ہے جو کہیں سے شروع نہیں ہوتا اور نہ کہیں ختم ہوتا ہے. لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم وقت کو خطِ مستقیم میں سفر کرنے والی غیر محسوس اور نامعلوم شے سمجھتے ہیں اور ہم یہ نہیں سمجھتے کہ وقت گردش میں ہے اور اس گردش نے ایک دائرے کو جنم دیا ہے اور دائرہ جب مکمل ہو جاتا ہے تو پھر اس کے بارے میں کون بتا سکتا ہے کہ اس کا نقطۂ آغاز کہاں ہے اور نقطۂ انجام کہاں ۔ وقت بھی کبھی نہیں گزرتا ہمیشہ لوٹ آتا ہے. کیونکہ گردش کرنے والی چیز اپنے آغاز کی طرف لوٹتی ہے اور کتنی عجیب بات ہے کہ آغاز ہی انجام بھی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بھی غلط ہے کہ وقت اپنے آغاز کی طرف لوٹتا ہے. بس یوں ہے کہ وقت گردش میں ہے اور ہم سب اس گردش کا ایک حصہ ہیں. وقت کائنات کے دائرے میں گردش کرنے والی دھول ہے جو ہمارے سروں پر جمتی ہے تو بڑھاپا بن جاتی ہے اور ہمارے بدن سے لپٹتی ہے تو ہم مٹی میں مل جاتے ہیں. وقت خاک ہے اور رباد ہے، وقت خدا ہے اور کائنات ہے، وقت سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔

میں وقت کو شکل دینا چاہتی ہوں، اس کی تجسیم چاہتی ہوں اور جب یہ خواہش مجھے

ہلاک کرنے لگتی ہے تو میں کائنات کے تمام رنگ اپنی ہتھیلی پر سجالیتی ہوں اور مشتری کی انگلی سے وقت کے خدوخال کھینچنا چاہتی ہوں لیکن وقت کی فراخی، وسعت اور اس کی ازلیت اور ابدیت میری آنکھوں کی پتلیوں پر اپنی کوئی شبیہہ، اپنی کوئی تصویر نہیں بننے دیتی۔ میں سوچتی ہوں کہ وقت کا تصور کس طرح قائم کروں کہ گویائی اس کے نقش ونگار بیان نہیں کرسکتی اور بینائی اس کے دیدار سے قاصر ہے۔

وقت نے کائنات میں عجب بساط بچھائی ہے، اس کے کھیل کا انداز نرالا ہے، اس کے مہروں کا کوئی رنگ نہیں، ان کی کوئی شکل نہیں اور اس کا کوئی حریف نہیں۔ وہ خود اپنا مقابل ہے اور اس کی غیرمرئی انگلیاں کائنات کی بساط کے مہروں کو گردش میں لاتی ہیں، کبھی وہ اپنے آپ سے جیت جاتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو آن کی آن میں شہ مات دے دیتا ہے۔ یہ بھی اس کے کھیل کا ایک حصہ ہے کہ میں اب اپنے سامنے یوں بیٹھی ہوں۔ جیسے آئینہ آئینے کا سامنا کرے۔ میں سامنے والے اپنے وجود کو چھوتی ہوں لیکن وہاں کچھ بھی نہیں ہے، سب کچھ خواب درخواب ہے اور سراب اندر سراب۔ خلا ہے، کائنات بھی معدوم ہے اور سمندر کی لہریں جو مجھے نظر آرہی ہیں وہ بھی کہیں نہیں ہیں۔ میری آنکھیں جن چیزوں کو دیکھ رہی ہیں میرے ہاتھ انہیں چھُونے پر قادر نہیں۔ میں ہی کائنات ہوں اور میں ہی رنگ، میں ہی آگ ہوں اور میں ہی راکھ۔ میں کبھی اپنے آپ کو سمندر کہہ کر یاد کرتی ہوں اور کبھی اپنی ذات کو بادبان یا صحرا کے نام سے پکارتی ہوں۔ کائنات کے دائرے میں صرف میری ہی آواز گونجتی ہے لیکن پھر یوں بھی ہے کہ میری آواز جو کائنات پر محیط ہے سمٹ کر کبھی سانس کی سرسراہٹ بن جاتی ہے اور کبھی تیز ہوا کی سنسناہٹ۔

بادبانوں کے دامن میں تیز ہوا کی سنسناہٹ بھر جاتی تو جہاز لنگر اٹھاتے ہی اڑ ایک ہزار جہازوں پر ایستادہ ہو کر دس سالہ جنگ کی طرف سفر کرتے ہیں اور ہاں یہی بادبان جب سوگ کا لبادہ اتارنا بھول جائیں تو سمندر کا نام بدل جاتا ہے۔ مجھے ان بادبانوں سے

خوف محسوس ہوتا ہے۔ میں ان کے رحم و کرم پر کہیں کا سفر کرنا نہیں چاہتی۔ ان بادبانوں نے انسانوں کو بہت دُکھ دیے ہیں، بہت رُسوا کیا ہے لیکن یہ بھی ہے کہ ان سے مفر نہیں۔

مفر تو اس بات سے بھی نہیں کہ میں جو اپنے رو بہ رو دھتی ایک بار پھر گم ہو گئی ہوں، اور حصارِ ذات میں آ گئی ہوں۔ جانے والے اپنے اپنے تیر، تبر، تلواریں اور تیغے لے کر واپس جا چکے ہیں، شاید انہوں نے سپر ڈال دی لیکن اب جب کہ ان کے خیمے اور ان کے جہاز مجھے نظر نہیں آ رہے، مجھے اس ٹروجن ہارس سے ڈر لگ رہا ہے جسے میں اپنے ہاتھوں حصار کے اندر لائی ہوں۔ وجود کی شہر پناہ پر آنکھوں کے دیدبان پہرا دیتے ہیں لیکن جب سحر ہو گی اور شہر پناہ میں بنے ہوئے دروازے کھول دیے جائیں گے اور قلعۂ ذات پر نگہبانی کے لیے معمورِ انا کا دیوتا اونگھ جائے گا تو وجود کہاں پناہ چاہے گا؟

مجھے کائنات کی قلمرو نہیں چاہیے۔ میں تو منتظر آنکھوں والی ہوں اور مجھے سمندر کا انتظار ہے لیکن وہ مجھ تک نہیں آتا۔ وہ اپنی کہنیوں کے بل اٹھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے اور پھر تھک کر لیٹ جاتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ اٹھوں اور اس کی طرف سفر کروں لیکن جب میں اس کی طرف چلنا چاہتی ہوں تو میرے پیر نہیں اٹھتے اور تب مجھے یاد آتا ہے کہ میرا نچلا دھڑ تو گرد باد کا ہے اور مجھے شفاف دیواروں والے اس حصار میں مقید کر دیا گیا ہے۔ باہر دروازے پر میری سیاہ آنکھیں پہرا دیتی ہیں اور ان کی چمک میرے اعصاب کو جیسے سُلا دیتی ہے، تب میں سوچتی ہوں کہ مجھے اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب سمندر کی تھکن اتر جائے اور وہ میرے پاس چلا آئے۔

تو میری رُوداد کچھ یوں ہے کہ میں ہر رات اپنے گرد باد کے قدموں سے اٹھ کر یہاں اس شفاف دیوار تک آتی ہوں اور سمندر کو دیکھتی ہوں۔ میں حصارِ ذات سے باہر کیسے آؤں کہ میری آنکھیں میرے دیدبان ہیں۔

پانیوں میں سراب

لوحِ مزار پر "عصمت پناہ" پڑھ کر میں بے ساختہ ہنسی اور میں نے اظفر سے کہا۔
"میری قبر پر بھی "عصمت پناہ" کندہ کروا دینا۔"

اظفر بے معنی سے انداز میں مسکرایا اور ہم قبروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے باہر آ گئے۔ گاڑی روانہ ہوئی تو احسن نے اچانک "عصمت پناہ" کی ترکیب کا ذکر چھیڑ دیا اور بات نظریۂ عصمت اور تاریخ کے مختلف ادوار میں عصمت کے معیار تک پہنچی۔ الف لیلہ کا شہریار، بے وفا شہزادیاں اور ان کی خلوتوں میں بار پانے والے حبشی غلام، بغداد کے گلی کوچے، نیپلز اور فلورنس کی حویلیاں اور باغات "ڈی کیمرون" کی پامپینا، نی فیتی اور رسیڈ ملینی۔ دل ہتھیلی پر رکھ کر پھرنے والے عشاق اور شوہروں کے پیٹھ پھیرتے ہی خواب گاہوں کے در کھول دینے والی نازنینیں۔

میں نے موضوع بدلنا چاہا لیکن بات سے بات نکلتی چلی گئی اور پھر اس نکتے پر بحث ہونے لگی کہ عصمت و عفت کا تصور مطلق ہے یا اضافی؟ درمیان میں لطیفے اور چٹکلے بھی بیان ہو رہے تھے اور پھر Chastity Belt کا ذکر نکل آیا۔

احسن نے فوراً ہی صلیبی جنگ پر جانے والے ایک ایسے مسیحی سورما کا قصہ چھیڑ دیا

جس نے جنگ پر روانگی سے پہلے اپنی بیوی کو Chastity Belt پہنوائی اور
چابی اپنے عزیز ترین دوست کے حوالے کر گیا۔ اصولی طور پر چابی اسے اپنے ساتھ لے
جانی چاہیے تھی لیکن وہ ایک منصف مزاج آدمی تھا اور اسی لیے اس نے چابی دوست کے حوالے کر
دی تھی کہ اگر وہ جنگ میں مارا جائے تو چابی اس کی بیوی کے سپرد کر دی جائے تاکہ وہ جس سے
چاہے شادی کر سکے۔ ابھی وہ سورما کچھ ہی دُور گیا تھا کہ اس کا دوست گھوڑا سرپٹ
دوڑاتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور کہنے لگا "تم مجھے غلطی سے کوئی دوسری چابی دے آئے
ہو، یہ Chastity Belt کی چابی تو نہیں ہے۔"

ایک قصہ کسی شہزادی کا تھا جس نے اپنے محبوب شوہر کی جنگ پر روانگی سے
پہلے Chastity Belt پہن کر چابی شوہر کے سامنے ہی ایک تالاب میں پھینک
دی تھی۔ کچھ دنوں بعد جب وہ کسی دوسرے مرد کے عشق میں گرفتار ہوئی تو اس نے اپنی
ساری دولت ان غوطہ خوروں کو دے ڈالی جو تلاش بسیار کے باوجود چابی کی تلاش میں
ناکام رہے تھے۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے قصے اس وقت تک بیان ہوتے رہے
جب تک کہ ہم کنجھر جھیل نہ پہنچ گئے۔

اور اب ہم پانیوں پر تھے۔ سونا لٹاتی دھوپ جھیل کے پگھلے کانچ جیسے سبز پانی پر
بچھی تھی۔ نہ میں آبی پودے لہروں کے ساتھ ہلکورے لے رہے تھے اور سبز کائی ان
سے لپٹی ہوئی تھی۔ جل کوّوں کی ایک ڈار پھڑپھڑاتی اتری اور پانیوں پر سفر کرنے لگی۔ کشتی آگے
بڑھ رہی تھی، زمینی منظر دُور ہوتے جا رہے تھے۔ پیڑ، ان پیڑوں کے سائے میں بیٹھے
انسان، بڑے بڑے ٹرک جو جھیل کے کنارے نہایت مستعدی سے دھوئے جا رہے تھے،
اب دُوری کے سبب ہیولے لگ رہے تھے۔

میرے عقب میں آواز ہوئی تو میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ کنارے کے قریب
اظفر نے ایک مچھلی پکڑی تھی اور اب وہی کشتی کے فرش پر تڑپ رہی تھی۔ یہ اسی کے

تڑپنے پھڑکنے کی آواز تھی۔

"اظفر پلیز، اسے پانی میں پھینک دو"۔ میں نے بے تابی سے کہا۔

"بمشکل تمام ایک تو ہاتھ آئی ہے اور تم کہہ رہی ہو کر اسے واپس پھینک دوں، جواب نہیں ہے تمہارا بھی"۔ اظفر کی آنکھوں میں مچھلی کو تڑپتے دیکھ کر لذت کی ایک لکیر کھنچ گئی۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھے یوسف کی طرف دیکھا اور اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

صفیہ احسن نے تھرماس کھول کر مگوں میں کافی انڈیلنی شروع کی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ سموسے ٹھنڈے ہو گئے تھے لیکن گرما گرم کافی کے ساتھ وہ بھی لطف دے رہے تھے۔

کافی گھونٹ گھونٹ کر کے پیے جانے کے لیے ہے۔ سموسے لقمہ لقمہ کر کے کھائے جانے کے لیے ہیں۔ اور میں اس لیے ہوں کہ دن میں ہجر کا عذاب مجھے پانی کرے اور میں اس لیے ہوں کہ رات آئے تو میرے مجازی خدا کے بدن کی سرشاری کا گدھ میرے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھائے۔ مجھ سے اچھی تو یہ کافی ٹھہری جو ایک لمحے میں پی لی جاتی ہے اور معدوم ہو جاتی ہے، مجھ سے بہتر تو سموسے کا یہ لقمہ ہے جسے صرف ایک مرتبہ چبایا جاتا ہے اور پھر نجات پا لیتا ہے۔ ہر رات مجھے چباتی ہے اور میں ختم نہیں ہوتی۔ ہر دن مجھے پیتا ہے اور میں موجود رہتی ہوں۔

کافی پیتے ہوئے احسن نے گنگنانا شروع کر دیا۔ "اکیلے مت جیہو رادھے جمنا کے تیر"۔ میں نے لرز کر اسے دیکھا۔ تم دلوں کے بھید کس طرح جانتے ہو، سنا ہے دلوں کا بھید تو بس خدا جانتا ہے اور کون جانے کہ جاننے یا نہ جاننے کے مرتبے پر فائز موجود ہے یا معدوم۔

احسن کی آواز پانیوں پر بگولے کی طرح چکراتی ہوئی اٹھی۔ "اکیلے مت جیہو رادھے، اکیلے مت جیہو رادھے"۔ کینجھر جھیل کا پانی اترنے لگا۔ زمین کی گہرائیوں میں سمانے لگا اور

آنکھ کی پُتلی پر جمنا کا گہرا سبز پانی پھیل گیا، گہرائیوں میں اترتا ہوا، وسعتوں میں پھیلا ہوا۔

میں اکیلی تو نہ گئی تھی، میں تنہا تو نہ گئی تھی۔ مجھے تو خود اظفر تنہا چھوڑ گیا تھا۔ بمبئی میں کئی لوگوں سے ملاقاتیں ضروری تھیں ورنہ جس بزنس ٹور پر وہ گیا تھا، وہ ناکام ہو جاتا۔ وہ دو دن کے لیے گیا تھا، پھر اس کا فون آیا کہ اسے ابھی دو دن اور لگیں گے۔

میں اور یوسف دلّی میں گھومتے رہے، میں اس سے اظفر کی بے اعتنائیوں کا ذکر کرتی رہی اور وہ سُنتا رہا۔ میں نے اس سے کہا صرف روپیا ہی تو کوئی چیز نہیں ہوتا، سب سے بڑی چیز محبت ہے، دوسرا ہمت ہے جس کے لیے اظفر کے پاس وقت نہیں۔ بیوی بچے اور رشتہ دار یہ سب ثانوی چیزیں ہیں۔ اصل مسئلہ روپیا ہے اور مزید روپیا۔

میرا ذہنی سفر خوابوں سے شروع ہو کر کتابوں پر ختم ہوتا تھا۔ روپے سے کتابیں تو خریدی جا سکتی تھیں لیکن خواب کسی بازار میں نہیں بکتے تھے اور سکّۂ رائج الوقت سے خریدے نہیں جا سکتے تھے۔ پھر میں اتنا بہت سا روپیا لے کر کیا کرتی؟ ہمارا مستقبل محفوظ سے محفوظ تر ہو رہا تھا لیکن میں کہاں تھی؟ میری گزرتی ہوئی زندگی کے لمحاتِ رائیگاں کا حساب کہاں تھا؟

یوسف اور اظفر بچپن کے دوست تھے، یارِ غار۔ مزاجوں کے تفاوت کے باوجود جب بھی انہیں موقع ملتا وہ مل بیٹھتے۔ اظفر نے باپ کی طرح تجارت اختیار کی اور لاکھوں کمائے۔ یوسف شروع ہی سے خواب دیکھتا تھا محلوں کے، قلعوں کے، حویلیوں اور بھول بھلیوں کے، وہ آرکیٹکٹ بن بیٹھا۔ سیمنٹ، بجری، پتھر، چونے، لوہے اور المونیم کے ڈھیر کو خواب نما عمارتوں میں بدل دینے والا انسان۔

یوسف کی بنائی ہوئی خواب خواب عمارتیں امریکہ، کانٹی نینٹ اور مشرقِ بعید

کے ملکوں میں پھیلی ہوئی تھیں، وہ انٹرنیشنل سیلے بریٹی تھا۔

لندن میں جب میرا وقت یوسف کے ساتھ گزرا تو اس کی ذات کی ایک نئی جہت مجھ پر کھلی۔ ریت پتھر اور چونے جیسی کھردری چیزوں سے مختلف عمارتوں کی تجسیم کرنے والا اندر سے پورا پورا شاعر تھا۔ وہ جب عالمِ سرشاری میں ہوتا تو فنِ تعمیر پر عجیب زاویوں سے گفتگو کرتا۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا کہ کسی عمارت کی تعمیر دراصل مادّے کا قلبِ ماہیت ہے۔

وہ گوتھک طرزِ تعمیر کا اور گرجا گھروں کا عاشق تھا۔ ان کی قربان گاہیں، ان کی راہداریاں، ان کے حجرۂ اعترافات، یہ تمام مقامات اس کے خیال میں کنائے تھے، انسانی نفس کی گہرائیوں، پشیمانیوں اور عیسٰی مسیح سے قربت کے کنائے۔

وہ کہتا کہ کوئی بھی عظیم عمارت اپنے عہد کا استعارہ ہوتی ہے اور جب تک اس استعارے کو اپنے اندر سمو نہ لیا جائے، عمارت کا حسن اور اس کی سرّیت دیکھنے والے پر کھل نہیں سکتی۔

ایک رات وہ میرے فلیٹ پر پی رہا تھا اور باتیں کر رہا تھا۔ چار انگل شراب اس کے معدے میں پہنچ جاتی تو اس کے اندر کا شاعر جاگ جاتا اور اس کے منہ سے پھول جھڑنے لگتے۔ اس رات وہ باتیں کر رہا تھا، بورومینی کی، برمینی کی، البرٹی اور مائیکل اینجلو کی۔ وہ ان قدیم معماروں کو اپنا روحانی استاد سمجھتا تھا اور ان کی بنائی ہوئی عمارتوں کے ایک ایک طاقچے اور ستون پر اس کی جان جاتی تھی۔

اسی گفتگو کے دوران جانے کس طرح قدیم عمارتوں اور کھنڈروں کو چاندنی رات میں دیکھنے کی بات نکل آئی تو وہ بھڑک گیا: "کیسی باتیں کرتی ہو، یہ محض رومانیت زدہ عورتوں اور نالائق مردوں کے کرنے کی باتیں ہیں کہ روم کے فلاں کھنڈر کو چاندنی رات میں دیکھنا چاہیے اور پیرس کا فلاں کلیسا چاندنی میں کس قدر خوبصورت لگتا ہے۔ میں تمہیں بتاؤں، شالیمار باغ اور تاج محل کے سوا معدودے چند عمارتیں ہی ایسی ہیں جو چاندنی میں دیکھنے کے لیے بنائی

گئی ہیں۔ دنیا کی تمام عظیم عمارتیں دن کے اجالے میں دیکھنے کے لیے تعمیر ہوئی ہیں۔ چڑھتے ہوئے اور سہ پہر کے سورج کی ترچھی کرنیں ان عمارتوں کے شکوہ کو نمایاں کرتی ہیں' ایک ایک دیوار کے حُسن کو اُجاگر کرتی ہیں اور ایک ایک گنبد کی گولائی کا احاطہ کرتی ہیں۔ قلعے، محل حویلیاں دن میں دیکھنے کی اور برتنے کی چیزیں ہیں۔ رات بیشتر عمارتوں کا حسن چُرا لیتی ہے ان کے خدوخال کا تیکھا پن چھپا لیتی ہے۔ اگر کوئی عمارت محض چاندنی رات ہی میں دلکش نظر آتی ہے تو سمجھ لو کہ اسے بڑی عمارتوں کی صف میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

وہ تعمیرات کی اقتصادیات اور سماجیات پر بحث کرتا۔ فلاں عمارت پر کتنا صرف ہوا؟ یہ رقم کہاں سے آئی تھی؟ لگان کس علاقے کے لوگوں سے وصول کیا گیا تھا اور ان پر کتنی سختی روا رکھی گئی تھی؟ ان عمارات کو تعمیر کرنے والے آزاد مزدور تھے یا مجبور اور بے بس غلام؟ ان کے معمار اختراع پسند لوگ تھے یا لکیر کے فقیر؟ ان کے مزدور کام کرتے ہوئے گیت گایا کرتے تھے یا فضا محض ان کی پُشت پر پڑنے والے چابکوں کی آواز سے گونجتی تھی؟

تعمیرات کے حوالے سے سیاست کے بارے میں اُس کے خیالات بہت اُلجھے ہوئے اور ناپسندیدہ تھے۔ اور یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پر میری اس کی خوب بحث ہوتی۔ اس کا کہنا تھا کہ دنیا کی بیشتر عظیم تعمیرات مطلق العنان فرمانرواؤں کے فیصلوں اور خواہشوں کی مرہونِ منّت ہیں اور یہ کہ جمہوریت فنِ تعمیر کو راس نہیں آسکتی۔

یوسف نے لندن کی ایک ایک تاریخی عمارت مجھے دکھائی۔ وہ جب کسی عمارت کے ستونوں، محرابوں، دروں، دروازوں اور طاقوں کے بارے میں بات کرتا' جب وہ روشنی اور سائے کا حساب بتاتا' جب موسموں کے اعتبار سے ہوا کے چلنے اور دُھوپ کے اُترنے کا فرق بیان کرتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے یہ سُونی عمارتیں

آباد ہو گئی ہیں، پھر سے سانس لے رہی ہیں، جیسے ابھی دھوپ فصیلوں سے ہوتی ہوئی قلعے کے قلب میں اتری ہے اور بہزی ہشتم نے اپنی مسہری پر کروٹ بدل کر صبح کا پہلا جُرعہ حلق سے نیچے اتار لیا ہے۔

یوسف کو دوست داری کا عجیب ہنر آتا تھا۔ وہ اظفر کا دوست تھا لیکن میں جب اس سے ملتی، باتیں کرتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ محض میرا دوست ہے، کھرا، سچا، میرے تمام دُکھ سمجھنے والا۔ اس سے ملے ہوئے کچھ دن گزر جاتے تو دل میں خلش ہوتی، اس کا خط نہ آتا تو میں پریشان ہو کر اسے خط لکھتی۔ کیسے ہو؟ کہاں ہو؟ کس حال میں ہو؟ اتنے دنوں سے خط کیوں نہیں لکھا؟ اور پھر اس کا جواب آتا، طول طویل، دنیا جہان کی باتوں سے بھرا ہوا، میں اور اظفر دونوں اس کا خط پڑھ کر خوش ہو جاتے۔

اظفر اور میں ہندوستان کے لیے روانہ ہونے والے تھے کہ اچانک ایک شام یوسف لندن سے آپہنچا۔ وہ کچھ دنوں ہمارے ساتھ رہنے آیا تھا۔ آرام کرنے، اپنی تھکن اتارنے۔ یوسف کو معلوم ہوا کہ ہم ہندوستان جا رہے ہیں تو وہ بھی ہمارے ساتھ چل پڑا۔ ہم تینوں دلّی پہنچے اور اظفر حسب معمول مجھے ہوٹل میں چھوڑ کر بمبئی چلا گیا۔ وہ مایا موہ میں پھنسا تھا اور اس جال سے نکلنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

یوسف اور میں، ہم دونوں دلّی کے گلی کوچوں میں گھومتے رہے۔ قلعے، مسجدیں، مزار، دروازے، باؤلیاں، کون سی جگہ تھی جو ہم نے چھوڑی ـــ کون سا ویرانہ تھا جو ہم نے آباد نہ کیا۔ ہم جمنا گئے، ہم گھاٹ کی سیڑھیاں اترے اور ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے۔ دوپہر کا گرم سورج ہمارے سروں پر تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ سنّاٹا تھا اور شاید یہ ویسا ہی کوئی لمحہ تھا جب خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی۔

میں نے جھک کر پانی میں ہاتھ ڈالا، پانی جو حیات کی اصل تھا اور یوسف سے مڑ کر

کچھ کہا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا اور ان آنکھوں میں کیا نہیں تھا۔

ہم اپنے تمام باطنی عذابوں اور ثوابوں، نادانیوں اور پشیمانیوں کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے عریاں تھے۔ آدم و حوا کی طرح جب انہوں نے شجرِ ممنوع کا پھل کھایا تھا اور برہنہ تن ہو گئے تھے، ہم دو نہ تھے، ہم جُدا نہ تھے، ہم بہت دنوں سے ایک دوسرے کو دوستی کے نام پر اور خلوص کے نام پر دھوکا دیتے رہے تھے۔ وہ ایک لمحہ ہر بات بدل گیا، ہر شے منقلب ہو گئی۔ نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا۔ وہ عجب گھڑی تھی، میں جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا۔

اچانک کشتی ڈگمگائی، آنکھ کی پتلی پر جو راس لیلا رچی تھی وہ معدوم ہو گئی، جمنا کا پانی چشم زدن میں غائب ہو گیا۔ ہم کنجر جھیل کے آبِ رواں پر تھے۔ یوسف اپنا زرد سوئمنگ کاسٹیوم پہنے کشتی کے اگلے حصے میں کھڑا تھا۔ بدن کو تولتا ہوا، پھر چھپاکا ہوا اور اس کا سنہرا بدن سبز پانیوں میں اُتر گیا۔ وہ ہماری کشتی کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا۔ ہم پر پانی کے چھینٹے اُڑاتا ہوا، پانی میں ڈبکی لگا کر پھر اُبھرتا ہوا۔ اس کے ننگے بدن کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اسی کی پسلی سے جنم لیا ہو، جیسے ہم ایک تن ہوں، زمین کا پہلا جوڑا۔ میں نے نظریں نیچی کر لیں، میں اُن لمحوں سے ڈرتی تھی جب اظفر میرے دل کی تحریر میرے چہرے پر پڑھ لے۔

دُور زمین و آسمان ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے، محض فریبِ نظر۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ ہم دونوں بھی افق کا وہ کنارہ تھے جسے دور سے دیکھو تو محسوس ہوتا ہے کہ زمین و آسمان شیر و شکر ہو رہے ہیں اور جب نظر کا فریب درمیان سے ہٹ جاتا تو ہم زمین و آسمان تھے جو کبھی نہیں مل سکتے۔

میں زمین تھی، ٹھوس، پتھریلی، اپنی جگہ اٹل۔ اور وہ آسمان تھا، محض خلا، آنکھ کا دھوکا۔ میں عورت تھی، کمزور، بے بضاعت، میں اس کے لیے کسی بھی انتہا تک جا سکتی تھی لیکن

یوسف مرد تھا، بہادر، جی دار اس لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لوگ کیا کہیں گے، بچوں کا کیا ہوگا، اظفر پر کیا گزرے گی، وہ دنیا کے تمام برِ اعظم گھوم آیا۔ دنیا بھر کی دولت اس نے اکھٹی کرلی۔ انٹرنیشنل سیلے بریٹی بن بیٹھا لیکن متوسط طبقے کی اخلاقی اقدار اس کے اندر اپنے پنجے گاڑے بیٹھی تھیں۔ وہ دوست کی لاعلمی میں اس کی بیوی کو Share تو کر سکتا ہے لیکن اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اظفر کا سامنا کرے اور اسے ایمانداری کے ساتھ اپنے اور میرے نفس کی حالت سے آگاہ کرے اور پھر فیصلہ اس پر چھوڑ دے، مجھے معلوم تھا کہ اظفر کا فیصلہ کیا ہوگا اور یوسف بھی جانتا تھا لیکن یوسف کی اخلاقی اقدار بھی خوب تھیں، محض منافقت، محض ریاکاری۔

اور اب میں دو مردوں کے درمیان زندگی گزارتی ہوں۔ اظفر، جس کی زمین اپنی نہیں، جس کے گھر میں سیندھ لگ چکی ہے اور یوسف جو اپنی زمین کو دوسرے کے تسلط سے آزاد کراتے ہوئے ڈرتا ہے جس کی زمین کا خراج کسی دوسرے کے خزانے میں جمع ہوتا ہے، اور ان دونوں کے درمیان میں ہوں۔ تلپھے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں۔

"بیگم اظفر کیا آپ جانتی ہیں کہ اس وقت آپ کہاں ہیں"؟ احسن نے اچانک ڈرامائی انداز میں سوال کیا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی"؟ میں نے قدرے حیران ہو کر احسن کو دیکھا، وہ اظفر کے لندن آفس کا منیجر تھا اور ان دنوں اپنی بیوی کے ساتھ کراچی آیا ہوا تھا۔ "آپ اس وقت نوری جام تماچی کے مزار پر سے گزر رہی ہیں"! اس نے مجھے مطلع کیا۔

"کیا پہیلیاں بجھا رہے ہو احسن"؟ اظفر بھی اب اس طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"اظفر صاحب، ہم واقعی نوری جام تماچی کے مزار پر سے گزر رہے ہیں۔ یہ دراصل مون سون کا موسم ہے۔ پانی چھلکا پڑ رہا ہے اس لیے دونوں کے مزار زیرِ آب ہیں ورنہ عام دنوں میں ایک چھوٹے سے ٹاپو پر ان دونوں کے شکستہ مزار نظر آتے ہیں، آس پاس

کے لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ چاندنی راتوں میں نوری انہیں جھیل کی سیر کرتی نظر آتی ہے"۔ احسن نے کہا۔

"بھئی تم لوگ آخر کس چکر میں پڑ گئے ہو، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہماری بیگم صاحبہ مکلی کے مزارات سے لو لگا رہی تھیں، بڑی مشکل سے انہیں وہاں سے گھسیٹ کر لائے ہیں۔ اب تم پھر مزاروں کا ذکر لے بیٹھے ہو" اظفر نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ "اُدھر یوسف ہے تو وہ اتنی سنجیدگی سے پانی میں ڈبکیاں لگا رہا ہے جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو" پھر اس نے بہ آوازِ بلند یوسف کو مخاطب کیا۔ "یار پلیٹ آؤ۔ کسی شہزادی نے اپنی Chastity Belt کی چابی یہاں نہیں پھینکی ہے جو تم ڈبکیاں لگا رہے ہو"۔

یوسف نے اس کا جملہ سُنا تو مسکرایا اور کشتی کی طرف پلٹا۔ احسن بھی ہنسنے لگا۔ "یوسف صاحب نے تو بہت سی چابیاں اکٹھی کی ہوں گی"۔

"یہ میرا یار ہے جو بہت گھُنّا ہے، ایسی باتوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا"۔ اظفر نے کہا۔

اب یوسف کشتی میں پہنچ چکا تھا اور اس کے بدن سے ٹپکتے ہوئے پانی کے قطرے کشتی کے فرش پر جمع ہو رہے تھے۔ وہاں بڑی مچھلی اب ختم ہو چکی تھی۔ صوفیہ احسن نے نگاہیں اٹھا کر بے اعتنائی سے ہم سب کو دیکھا اور پھر اپنی اسکیچ بک پر جھک گئی۔ اس میں سب سے بڑی خرابی کم گوئی اور سب سے بڑی خوبی مصوری تھی۔ چند ہفتوں بعد سڈنی میں اس کی تصویروں کی نمائش ہونے والی تھی۔

میں نے جھک کر پانی کو دیکھا، پانی جو بہتی ہوئی سَرِیت ہے۔ مچھلی ہوئی ہیبت ہے، حیات کی اصل ہے، رگ وید میں کہا گیا ہے:

"اس وقت نہ عدم تھا نہ وجود، نہ عالم باد اور نہ آسمان، جو اس سے پرے ہے۔ کیا چیز سب کو محیط تھی اور وہ سب کچھ کہاں قائم تھا؟ کیا وہ پانی اور عمق بے پایاں تھا؟ یہ پانی جس کے سینے پر ہم اس وقت رواں تھے، عمق بے پایاں نہ تھا لیکن پانی تھا۔

پانی جس میں سب سے پہلے "کام" (خواہش) نمودار ہوئی اور یہ خواہش عقل یا روح کا ابتدائی تخم تھی۔

خواہش، عقل، روح، عشق ـــ میں ان چاروں کے دام میں تھی۔ بادل کا ایک ٹکڑا ہماری کشتی کے اوپر سایہ کیے ہوئے تھا اور ساتھ ساتھ چل رہا تھا، شاید ہم واقعی نوری جام تماچی کے مزار پر سے گزر رہے ہوں گے۔ صدیوں پہلے کا وہ زمانہ کیسا رہا ہوگا جب کینجھر کے کنارے مچھیروں کی ایک بستی تھی اور سمہ خاندان کا سردار جام تماچی اس بستی کی ایک مچھیرن نوری کو اپنا دل ہار گیا تھا۔

یہ جو ساتھ جاگتے تھے، اب صدیوں سے ساتھ سو رہے تھے اور ان کے ساتھ نہ جانے کتنے مکمل اور نامکمل بوسے سو رہے تھے، کتنی آسودہ اور ناآسودہ ہم آغوشیاں سو رہی تھیں۔ مجھے شاہ کا "سُر کاموڈ" یاد آیا۔ یہ راگنی جس کا تعلق دیپک راگ سے بتایا جاتا ہے، شروع سے آخر تک نوری جام تماچی کے عشق بلاخیز کا قصہ سناتی ہے۔ شاہ کی آواز آئی:

"دھن دولت جتنا میں بانٹے، مایا جال کو توڑا، کینجھر کی گندری کے کارن راج پاٹ کو چھوڑا۔"

راج پاٹ کو چھوڑنے والا اور کینجھر کی گندری تہِ آب سوتے تھے۔ لیکن غرقِ دریا ہونے کی تمنا تو غالب نے کی تھی: "ہوتے کیوں نہ غرقِ دریا، نہ کہیں مزار ہوتا!"

مکلی کے مزار میری نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ چودھویں صدی کی قبروں پر سایہ کیے چھتریاں، فیروزی اور گہرے نیلے رنگ کی شیشے کی طرح چمکتی اینٹیں، کائی نے دیواروں کو سیاہ کر دیا تھا۔ یہ مرزا خان بابا بن میرزا خان عیسیٰ خان ترخان (اوّل) کا مزار ہے۔ یہاں ملک راجپال اور راہنسا بائی سوتے ہیں۔ میرزا باقی بیگ ازبک، میرزا طغرل بیگ۔ یہ سونے والے جانے کہاں کہاں سے آئے تھے؟ کس کس علاقے کی مٹی کا خمیر یہاں قطار اندر قطار سوتا تھا۔ ترک، راجپوت، مغل، ازبک، ارغون ـــ دوست، دشمن، باپ بیٹے، محرم،

نامحرم سب خاک میں مل کر خاک ہو گئے تھے۔ مٹی نے تمام راز اپنے اندر چھپا لیے تھے
جیسے ماں اپنے سینے میں بچوں کے عیب چھپا لیتی ہے۔

اور جب چلتے چلتے رُک کر میں نے ایک قبر کا کتبہ پڑھا تو ٹھٹھک گئی تھی، لوحِ مزار پر لکھا تھا:

"بہ تاریخ بیست ششم ذی الحجہ ۱۰۸۲ھ عصمت پناہ جہاں بیگم فوت شد۔"

اس لمحے مجھے خیال آیا کہ میری لوحِ مزار پر "عصمت پناہ" کا لفظ کس قدر سجے گا؟
اور اسی لیے میں نے ہنس کر اظفر سے کہا تھا "میری لوحِ مزار پر بھی "عصمت پناہ" کندہ کرا دینا۔"

ہم کنجھر کے وسط میں تھے جب اظفر نے کشتی والے سے واپسی کے لیے کہا۔ جس پانی میں ہم نے آگے کا سفر کیا تھا اسی پانی میں اب واپس جا رہے تھے۔

اکثر میرا جی چاہتا ہے کہ میں وقت میں پیچھے چلی جاؤں لیکن واپسی کا سفر ممکن نہیں۔

میرا جی چاہتا ہے یوسف سے پوچھوں کہ تم یہ کب تک چھپاؤ گے کہ Chastity Belt کی چابی تمہارے پاس ہے؟ میں کسی ایک مرد کی عورت ہو کر رہنا چاہتی ہوں۔

کشتی کنارے کی طرف جا رہی ہے لیکن میں کنارے کی طرف نہیں جا سکتی۔ مجھے پانی کے بیچوں بیچ کھڑے رہنا ہے اور اس دن کا انتظار کرنا ہے جب چابی یوسف سے بھی گم ہو جائے۔ اظفر تو اُسے گم کر ہی چکا ہے۔

شیریں چشموں کی تلاش

کہکشاں کے جنگل میں عرفان کی آگ ہیکلِ سلیمانی کے بلند و بالا ستونوں کی شکل میں بھڑکتی ہے اور اس کی روشنی میں کائنات کے اِس سرے سے اُس سرے تک کھنچا ہوا حیات کا محراب نمایاں نظر آتا ہے۔

ہم عدم سے وجود میں آتے ہیں تو اس پُل پر پہلا قدم رکھتے ہیں اور آگے کی طرف بڑھتے ہیں، جب فنا کا جھونکا ہمیں چھوتا ہے، ہم سُوکھے پتّوں کی طرح اس کا ہاتھ تھام کر اُڑتے ہیں اور پُل کے نیچے سے بہنے والے بے نیاز سمندر کے فراخ سینے پر گِر جاتے ہیں اور اس کے تموّج میں گُم ہو جاتے ہیں۔

تیز ہوا اچانک چل ہے اور مٹیالی رنگت کا پیوند لگا بادبان ہوا کے ساتھ چل نکلنے کو بے تاب ہو گیا ہے۔ سبزے سے ڈھکے ہوئے کنارے آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں اور کشتی کا رُخ اب دوسری جانب ہے جہاں بہت دور سُرخ رنگت کے کھپریلوں والے مکان اور تماڑ کے درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے ہیں۔ سورج کی روشنی اِن مکانوں کی چھتوں اور تماڑ کے درختوں سے گلے مل کر رخصت ہو رہی ہے ایک اور دن اختتام کو پہنچا، ایک اور رات اس لیے سر پہ آئی کہ اُسے بُرتا جائے اور

پھر اُسے بھی وقت کی اکائیوں میں گزار کر نہ ہونے کا اعزاز بخشا جائے۔

میں اپنی نشست پر بیٹھے ہی بیٹھے آگے کی طرف جھکتی ہوں اور میرا دایاں ہاتھ سمندر کو محسوس کرتا ہے۔ سمندر کی نرم اور خنک لہریں میری انگلیوں کا بوسہ لے رہی ہیں۔ سمندر بہتی ہوئی پیاس ہے اور میں سمٹی ہوئی پیاس۔ میرے وجود کا ایک ایک ذرّہ جو اپنی ذات میں صحرا ہے ازل سے تشنگی کے ریگزار میں بھٹک رہا ہے۔ پیاس میرے اندر ہے اور پیاس میرے باہر۔

شیریں چشموں کی تلاش مجھے وجود کے نشیب میں لے جاتی ہے لیکن اندھے نشیب کی پیاس جہنم کی آگ کی طرح بھڑکتی ہے، اس نشیب میں ایک بھول بھلیاں ہے اور میں اُس میں گم ہوں۔ میں اپنا پیچھا کر رہی ہوں پر ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ مجھے اپنے قدموں کی چاپ کبھی پیچھے سے آتی سنائی دیتی ہے، کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانب سے۔ ہر مرتبہ جب مجھے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اگلا موڑ مڑتے ہی میں اپنے آپ کو گرفتار کر لوں گی، عین اسی وقت مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میری ہنسی کی آواز اگلے موڑ سے نہیں کسی دوسری جانب سے آئی ہے۔ بھول بھلیوں میں جب تم خود ہی چھپ رہے ہو، خود ہی پیچھا کر رہے ہو اور بھٹک رہے ہو تو یہ سب کچھ ذات کی نفی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

میں بھاگتے بھاگتے تھک جاتی ہوں اور میرا ادھ نیم وجود تین حصّوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور یہ تیسرا وجود مینوطور کا ہے اور مینوطور خود بھی دو نیم ہے۔ اس نصف انسان اور نصف حیوان کا وجود بھی بھول بھلیوں میں آباد ہے اور وہ اُس سے باہر آنے کے لیے ٹکراتا ہوا بے تاب پھرتا ہے۔ اور جب اُسے کوئی راستہ نہیں ملتا تو وہ جس کے پیروں میں طوفان کی لپک اور آنکھوں میں عقابی چمک ہے، ہاں وہی اپنی پیشانی پر اُگے ہوئے سینگوں سے میری ذات کو لہولہان کر دیتا ہے۔ اس کے خیال میں میری آنکھیں ان بھول بھلیوں کے دو راستے ہیں جن میں وہ اسیر ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ

میں تو اپنی قیدی آپ ہوں وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ عنکبوت نے میری آنکھوں میں اپنا گھر بنایا ہے
اور مجھے اپنے وجود کے نشیب سے باہر آنے کا راستہ نہیں ملتا. اب معاملہ کچھ یوں
ہے کہ میرا پارہ پارہ وجود اپنے آپ سے پناہ چاہے یا اپنے وجود کی دوسری، تیسری، چوتھی
اور مہا سنکھویں تقسیم سے ۔ وجود کی یہ تقسیم بھی تفریق کی دوسری شکل ہے، اس لیے
جب میں تقسیم ہوتی ہوں تو دراصل اپنے آپ کو، اپنے آپ میں سے تفریق کرتی ہوں.

ضرب، تقسیم اور جمع تفریق ۔ اعداد کائنات کے دائرے میں نیبولوں کی طرح پھٹتے
ہیں، وہ کبھی شہابیوں کی طرح روشن لکیریں کھینچتے ہوئے فنا کے اندھے کنوئیں میں اتر
جاتے ہیں اور کبھی نامعلوم کہکشانوں میں بکھرے ہوئے ان گنت سورجوں کی مانند جگمگاتے
ہیں. کائنات نے اپنے آپ کو اعداد کی صورت میں تحریر کیا ہے اور میں اس تحریر کو پڑھنا چاہتی
ہوں، پر یوں ہے کہ میں اعداد کی عظمت سے ہیبت زدہ ہوں اور چشم حیرت وا کیے
اُن سایوں کو دیکھتی ہوں جو حقیقت کا پرتو ہیں۔ لیکن حقیقت کہاں ہے؟ وہ شاید اعداد
میں مستور رہے یا پھر وہ ہماری ارواح میں وجدان بن کر پھیلی ہوئی ہے ۔

ہم جو اپنی روحوں کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں اس وجدان کا ادراک نہیں رکھتے۔
ہم اُس نابینا کی طرح ہیں جو فاقوں سے قریب مرگ ہے کیونکہ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ
اُس کے پاس روٹی خریدنے کے لیے درہم و دینار نہیں، وہ یہ نہیں جانتا کہ جس کھردری
زمین پر وہ لیٹا ہے اور پشت میں چبھنے والے کنکروں اور پتھروں کو برا بھلا کہہ رہا
ہے، وہ دراصل ناتراشیدہ ہیرے اور جواہرات ہیں. تو یوں ہے کہ حقیقت کے ہیرے
جواہر میری روح کی گہرائیوں میں پڑے سوتے ہیں اور میں حقیقت کو سمجھنے اور
جاننے کے تمام امکانات سے بے خبر اپنے آپ میں گم ہوں۔

سو جب میں تقسیم ہوتی ہوں تو دراصل اپنے آپ کو، اپنے آپ
میں سے تفریق کرتی ہوں، اس تفریقِ مسلسل کا خاتمہ نہیں ہے اور پھر اس کی انتہا صفر ہے.

اور صفر ہی وہ نقطہ ہے جو کائنات اور ماورائے کائنات میں ازل سے بھی پہلے موجود تھا اور ابد کے بعد بھی وہی پایا جائے گا۔ نقطہ عرفانِ ذات کی ابتدا ہے اور انتہا۔ اس کی ازل سے پہلے کی ازلیت اور ابد کے بعد کی ابدیت مجھے دہلا دیتی ہے۔

میری سر بسجدہ بینائی شہرِ برباد کے اُس نقطے کا نظارہ کرتی ہے جس نے کہا تھا "نقطہ اصل ہے جو نہ بڑھتی ہے اور نہ گھٹتی ہے، نہ فنا ہوتی ہے"۔ میری بینائی شہرِ برباد کے اُس چوک کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے جہاں نقطے کے بارے میں گفتگو کرنے والے نقطے کو اُس کے جاننے کی سزا دی گئی۔ پر جاننے کی یہ سزا بہت کم تھی کہ اس کی مدت زمین کی محض تین گردشوں پر محیط تھی۔ اور جب اُسے سولی دی گئی تو پہلے اُس کی انگلیاں کتری گئیں، پھر اس کے بازو تراشے گئے، پھر اس کے پیروں نے اس سے منہ پھیرا اور اُس کی آنکھوں نے اُس سے کنارہ کیا، میخوں نے اس کے وجود کو چھلنی کیا اور پتھروں نے اس کے بدن کو پارہ پارہ کیا۔

وائے ہو اُن آنکھوں پر جنہوں نے یہ دیکھا اور وائے ہو ان کانوں پر جنہوں نے یہ سُنا اور وائے ہو ان لوگوں پر جو اس کے بعد بھی نقطے کے انکاری رہے۔ اور ہاں، وائے ہو مجھ پر کہ اُس کے بدن کو تقسیم کیا گیا اور اُس نے اپنا راستہ پا لیا۔ پر میری ذات بھول بھلیوں میں تقسیم ہوتی ہے اور تفریق ہوتی ہے، میں گھٹتی ہوں اور گھٹائی جاتی ہوں اور پھر معدوم ہو جاتی ہوں۔ ایک وہ تھا جو ازل سے پہلے بھی نقطہ تھا اور ابد کے بعد بھی نقطہ ہی رہے گا اور ایک کہنے والا ہے جو معدوم ہو جائے گا۔ میں تقسیم و تفریق کی اور ضرب اور جمع کی اور اعداد کی اصل جاننا چاہتی ہوں کہ اپنی اکائی کو پہچانوں اور اس کائنات کے بارے میں کچھ سمجھوں جو محض اعداد کی بساط ہے اور آخر کار مجھے نگل جائیگی۔

اور یوں ہے کہ میں کچھ بھی نہیں جانتی اور سمندر کا سفر کرتی ہوں۔ ہر طرف ببول کے کانٹے ہیں جن سے میرا وجود لہولہان ہے اور پیاس ہے جو اندرونِ ذات منزلیں طے

کرتی ہے۔ سمندر مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے لیکن وہ سرتا پا کڑواہٹ ہے اسی لیے میں شیریں چشموں کی تلاش میں نکلتی ہوں اور بھول بھلیوں میں گم ہو جاتی ہوں۔

آسمان کا رنگ ابھی کچھ دیر پہلے کہیں گلابی تھا اور کہیں سبزی مائل نیلا، پھر یوں ہوا کہ تاریکی نے ان رنگوں کو نگل لیا، تمام رنگ معدوم ہو گئے اور تمام چہرے گم ہو گئے، لیکن میں سمندر کا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں، پُرجلال اور پُرشکوہ چہرہ، ہمیشگی کا چہرہ۔ میں اس کی شکن شکن پیشانی کی لکیریں گننا چاہتی ہوں، معدوم کر دینے والی لکیریں۔

میں کاغذ کی بہت سی قندیلیں ایک ایک کر کے روشن کرتی ہوں پھر انھیں لہروں کی منڈیر پر احتیاط سے رکھ دیتی ہوں۔ یہ روشن قندیلیں چند لمحوں کے لیے مجھے سمندر کا پُرشکوہ چہرہ اور اس کی شکن شکن پیشانی دکھاتی ہیں پھر قندیلیں پیچھے رہ جاتی ہیں اور سمندر کا روشن چہرہ بھی پیچھے رہ جاتا ہے۔

میں سفر میں ہوں اور کشتی سمندر پر اُگے ہوئے استخوانی ڈھانچوں کے جنگل سے گزر رہی ہے۔ ہزاروں، لاکھوں سال پرانے ان ڈھانچوں سے ان گنت آنکھیں لٹک رہی ہیں۔ کسی کی آنکھ کان میں جھول رہی ہے اور کسی کی آنکھوں نے سینے میں اپنا گھر بنایا ہے اور بعض ڈھانچے تو ایسے بھی ہیں جن کی آنکھیں ان کی انگلیوں سے لٹک رہی ہیں۔ یہ تمام آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں، میری ہر جنبش ان کی نظر میں ہے۔ نفرت کے زہر میں بجھی ہوئی یہ تمام آنکھیں میری طرف لپکتی ہیں۔ میرے وجود کو ہزار ہا پہلو سے ڈسنے کے لیے بے تاب اور مجھے بھی اپنے گروہ میں شامل کرنے پر مُصر۔ میں ہانپنے لگتی ہوں، یہ استخوانی جنگل میرے وجود کے نشیب میں بنی ہوئی بھول بھلیوں کی طرح پیچیدہ اور پُراسرار ہے اور اسی کی طرح نامعلوم موجودات سے بھرا ہوا۔

یہ آنکھیں مجھے اپنی طرف بلاتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ میں بھی اس جنگل کا ایک استخوانی

شجر بن جاؤں اور میری آنکھیں بھی اپنے حلقوں سے نکل کر میری ہتھیلیوں پر چپک جائیں یا پھر میری گردن میں جھولنے لگیں۔ میرے لیے آنکھوں کے اِس جنگل کے پاس بہت سے خوبصورت وعدے ہیں۔ ابدی زندگی کا وعدہ اور دیوتاؤں کے بسائے ہوئے شہرِ آسائش میں زندہ رہنے کا وعدہ۔ وہ تمام دلربا وعدے جو گزرے ہوئے تمام لوگوں سے کیے گئے اور آنے والے تمام لوگوں سے کیے جائیں گے۔

میں ناتواں ہوں پر میرا ارادہ قوی ہے۔ میری کشتی اس مہیب جنگل سے نکل کر اُس چٹان تک پہنچتی ہے جس پر کائی کی نہ جانے کتنی تہیں جمی ہوئی ہیں۔ اس چٹان پر ایک سایہ ایستادہ ہے اور اس کے دو چہرے ہیں۔ یہ چہرے دیکھنے والے کے سوا کسی اور کے چہرے نہیں۔ دہرائے ہوئے یہ چہرے جانتے ہیں کہ کسی بھی لمحے بپھرا ہوا سمندر ان پر غالب آ جائے گا اور پھر یہ کائی لگی چٹان اُن کے قدموں کی استقامت کو ترستی رہے گی، پر اس وقت وہ چہرے نہ ہوں گے، اُن کا سایہ نہ ہوگا اور ان کی آواز نہ ہوگی، صرف پتھر کا پچھتاوا ہوگا، پھر کائی پتھر کو کھائے گی کہ اُسے پچھتاوے سے نجات دلا سکے اور پچھتاوا پچھتاوے کو کھائے گا۔

پچھتاوا تو ہمیشہ سے پچھتاوے کو کھاتا آیا ہے پھر تمام پچھتاووں نے سمندر میں اپنا گھر بنایا ہے۔ ایک ایسے ہی پچھتاوے کے جزیرے سے گزرتے ہوئے میں نے اُسے دیکھا۔ وہ شہزادیوں کے سے طمطراق اور وقار کے ساتھ لہروں پر قدم رکھتی تھی اور شعلے اس کے نقشِ قدم چاٹتے تھے، پر جب میں نے اس کی راہ جانا چاہا تو زمین و آسمان ایک آواز سے بھر گئے اور سُنا گیا: تو گر فلسِ ماہیِ حیرتی چہ زنی زنجیر وجود دَم، بنشیں چو طوطیِ دمبدم بشنو خروشِ نہنگ لا۔

زمینوں اور آسمانوں میں گونجتی ہوئی اس آواز کو سُن کر میں نے جانا کہ وہ حضرتِ حق ہے، جنابِ نقطہ ہے۔

وہ آگے کی طرف جاتی تھی اور دراز داڑھیوں، خشونت زدہ چہروں اور ڈھیلی ڈھالی عباؤں والے سنگ زنی کرتے اور آوازے کستے ہوئے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ یہ وہ تھے جنہوں نے اپنی تختیوں کو اپنے گھٹنوں سے توڑ دیا تھا، اپنے قلم دریا بُرد کر دیے تھے اور اپنی دواتوں میں بھری ہوئی روشنائی جوہڑوں میں انڈیل دی تھی۔ یہ وہ تھے جو مدینۃ العلم کے شہری کہلانے کے مدعی تھے، باب العلم کو سجدے گزارتے تھے پر نقطے کے انکاری تھے۔

میں نے جناب نقطۂ عالیہ کی بے توقیری دیکھی اور گریہ کیا، میں نے اُن خشونت زدہ چہروں کو پہچانا اور ہیہات کہا۔ میں نے دیکھا کہ اُن کے اور ان ہی جیسے دوسرے انکاریوں کے ستائے ہوئے ان گنت روشن حروف سمندر پہ تیرتے ہوئے میری جانب آتے ہیں اور پھر کسی اور طرف کو نکل جاتے ہیں۔ میں جھک کر ان روشن حروف کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی ہوں لیکن وہ مسکراتے ہوئے میری انگلیوں سے پھسل جاتے ہیں، ان کی مسکراہٹ میں عجب استہزا ہے۔

"تم ہمیں اپنی گرفت میں نہیں لے سکتیں، تم نہ جانے کب سے اُن اوراق کو جلاتی چلی آئی ہو جن پہ ہمیں لکھا جاتا تھا۔ جب ہم جلتے تھے اور کراہتے تھے، تم نے ہمیں اپنے گھوڑوں کے سُموں تلے روندا پھر ہمیں راکھ بنا کر ہوا کے ہمراہ کیا، ہماری ہڈیوں سے حمام روشن کیے گئے اور ہمارے سینوں میں سُلگتے ہوئے سچ سے بھٹیوں کو بھڑکایا گیا۔ سو اب ہم تمہاری گرفت میں کبھی نہیں آئیں گے۔ ہم تمہارا ماضی ہیں اور ماضی اعمال کا وہ منجمد سمندر ہے جس پہ گزرے ہوئے واقعات اپنے نقش و نگار چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ نقش و نگار کبھی تحلیل نہیں ہوتے۔ کائنات میں وہ آگ ابھی فروزاں نہیں ہوئی جو ماضی کے منجمد سمندر کو پگھلا سکے۔ اور اگر وہ کبھی ناموجود آگ تمہارے ہاتھ آجائے تو اُسے لے کر ہمارے پاس آنا، پھر ہم بھی تمہاری گرفت میں آجائیں گے۔"

مجھ سے اور میرے ناموں سے شکوہ کناں روشن حروف تیرتے ہوئے میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور تب میں ہر یقین اور ہر گمان کو جھٹلاتی ہوں۔ اے سمندر! تو گواہ رہیو کہ میں ہر یقین اور ہر گمان کو جھٹلاتی ہوں۔ انکار کا عَلم میرے وجود کی انتہائی بلندیوں پر نصب ہے، اس عَلم کے وسط میں نقطہ ہے اور نقطے کے سینے میں عرفان کی آگ روشن ہے اور زمین و آسمان اسی کی روشنی سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور میں کہ وجود کے نشیب میں شیریں چشمے تلاش کرتی رہی اور بھول بھلیوں میں اپنا پیچھا کرتی رہی اور مینو طور کے سائے سے بھٹکتی رہی، ہاں وہی میں جب ایڑیاں اٹھا کر انکار کے اس عَلم پر اُبھرے ہوئے نقطے کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہوں تو عرفان کی آگ میری انگشتِ شہادت کو خشک ٹہنی کی طرح جلانے لگتی ہے۔ یہ آگ میری تشنگی بجھاتی ہے اور میں جان لیتی ہوں کہ انکار میں نجات ہے اور انکار ہی میری آخری پناہ ہے اور یہ بھی کہ سمندر بہت وسیع ہے، بہتی ہوئی پیاس ہے اور محض سراب ہے اور ہاں یہ بھی کہ سراب کے سفر میں اختتامِ سفر کا دکھ نہیں سہنا پڑتا۔

جل ہے سارا جال

شیشے کی دیواروں میں سبز پانی قید کاٹتا ہے، قیدی کے قدموں میں بجری
بچھی ہے۔ بجری میں سمندری پودے لگائے گئے ہیں، اسفنجی رنگ کے چھوٹے اور
بڑے کائی لگے پتھر ہیں، گھونگھے ہیں۔ قیدی سانس لیتا ہے، اس کے وجود سے بُلبلے
اُٹھتے ہیں اور سطح پر آکر دَم توڑ دیتے ہیں۔

ان بلبلوں کے درمیان ایک مچھلی آہستہ آہستہ تیر رہی ہے، تقریباً ایک فٹ
لمبی اور چپٹی۔ کاہی رنگ کی اس مچھلی کی دُم پر ایک گہرا سرخ دھبا ہے، سر پر سفید دھاریوں
والی کاہی جھالر ہے اور آنکھوں میں گھرے پانیوں سے ہجر کا ملال ہے۔ مجھے یہ مچھلی جانی
پہچانی لگتی ہے۔ میں ٹھٹھک کر اسے دیکھنے لگتی ہوں، یوں جیسے کوئی شناسا چہرے کو
پہچاننے کی، رشتوں کے Jigsaw Puzzle میں اُس چہرے کے
بچھڑے ٹکڑے کو بٹھانے کی کوشش کرے۔

میری بیٹی اٹک اٹک کر تختی پر لکھا ہوا نام پڑھنے لگتی ہے۔ وہ جو نام لیتی ہے میری سمجھ
میں نہیں آتا تو میں مچھلی کے چہرے سے نگاہ ہٹا کر اس کا ڈومیسائل سرٹیفکیٹ پڑھنے لگتی ہوں جو
ایکویریم کے سربراہ کی طرف سے جاری ہوا ہے۔ مچھلیوں کے نام ہیں، عرفیتیں ہیں، حسب نسب ہے، قومیتیں ہیں،

گہرے سمندر سے بند پانیوں تک ان کی ہجرتیں ہیں اور ہجرتوں کے بعد کے
Adjustments ہیں۔

اس کے نام Achilles Tang پر نظر پڑتے ہی مجھے یاد آجاتا ہے کہ
میں نے اس مچھلی کو کب اور کہاں دیکھا تھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے تمکنت یاد
آجاتی ہے۔ لوگ اُسے تمکنت اسد کے نام سے جانتے تھے۔ اس کے بارے
میں شہر میں کیسی کیسی باتیں نہ ہوتی تھیں، کیسے کیسے اسکینڈل اس کے نام سے منسوب
نہ تھے۔ لطف کی بات تو یہ تھی کہ اپنے بارے میں تمام اسکینڈل اس کے علم میں
تھے، وہ ان میں نمک مرچ لگا کر مجھے سناتی اور پھر ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی۔
وہ ریگستان میں سراب کی طرح تھی کہ نظر آتی تو پیاسے بھاگتے بھاگتے تھک جاتے،
ہانپنے لگتے، وہ سیتا نہ تھی، ساوتری نہ تھی، کچھ زیادہ ہی عورت تھی۔ اس کا بدن پُرگوشت
تھا، اس کی شریانوں میں گرم اور جیتا جاگتا خون بھنور بناتا تھا۔ اس بھنور میں ذائقوں
اور لذتوں کی روپہلی اور سنہری مچھلیاں تیرتی تھیں۔ وہ جب ہیپسٹر ساری باندھتی
تو دیکھنے والوں کو صاف نظر آتا کہ اس کے پیالۂ ناف میں آدھی چھٹانک مکھن بڑی
صفائی سے آسکتا ہے۔

میں اس کی حرکتوں پر جھنجلاتی، اسے سمجھاتی۔ وہ ہنس دیتی، ٹال جاتی۔ لوگوں
کے خیال میں وہ ایک ایسی عورت تھی جس کی ذہنی سطح مرتفع نہ ہونے کے برابر تھی لیکن
اس کے بارے میں یہ رائے رکھنے والے کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ اس کا اور میرا
برسوں کا ساتھ تھا۔ میں جانتی تھی کہ اسے سوانگ رچانے کا شوق ہے۔ جہل کا
سوانگ، آوارگی کا سوانگ۔

Achilles Tang سے میری پہلی ملاقات تمکنت کی خواب گاہ
میں ہوئی تھی۔ اس کے گھر کا ایک کمرا اچھا خاصا ایکوریم تھا۔ ہزار دل روپے اس نے

اپنے اس شوق پر برباد کیے تھے لیکن Achilles Tang اس کے جی کو شاید کچھ زیادہ ہی بھا گئی تھی، تب ہی تو اسے ایکوریم میں رکھنے کی بجائے اُس نے اپنی خواب گاہ کا انتخاب کیا تھا۔ یہ انڈو پیسفک کی باسی تھی اور تمکنت اُسے سنگاپور سے خرید کر نہایت اہتمام کے ساتھ لائی تھی۔

اس وقت بھی Achilles Tang کو ایکوریم میں تیرتے ہوئے دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ بارہ انچ لمبی اسی مچھلی نے تمکنت اور ارکو ڈُور اسد میں جدائی ڈلوائی تھی۔ تمکنت اسے ہر لمحہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہتی تھی اور اسد کو مچھلیوں سے نفرت تھی۔ وہ گھر کے ایک کمرے کو ایکوریم کے طور پر برداشت کر سکتا تھا لیکن اپنے کمرے میں ۲۴ گھنٹے ایک مچھلی کی موجودگی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ کئی جھڑپوں کے بعد یہ طے پایا کہ دونوں الگ الگ کمروں میں زندگی گزاریں اور جب ایک دوسرے کی یاد ستائے تو کسی تیسرے کمرے میں مل لیا کریں۔

تمکنت کو اپنی بیٹی ارم سب سے زیادہ پیاری تھی۔ وہ اکثر کہتی کہ پہلے کی کہانیوں میں شہزادی کی جان کسی طوطے کی بائیں آنکھ کی پتلی میں ہوتی تھی یا دیو کے بالے میں پروئے ہوئے موتی میں۔ لیکن میری جان ارم میں ہے۔ اسی لیے وہ اُسے "زندگی" کہتی تھی۔

اسد اور تمکنت دونوں Jet Set کے لوگ تھے اور اسی ڈھب کی زندگی گزارتے تھے۔ ڈرنکس، ڈسکو، کارڈز، کلب، سوئمنگ، رائڈنگ۔ لیکن ارم تک خواہشوں کے ان بھڑکتے ہوئے شعلوں کی آنچ نہیں پہنچتی تھی۔ یہ نہ تھا کہ اسد اور تمکنت نے ارم کو زندگی کے Main Stream سے کاٹ رکھا ہو۔ وہ کانونٹ میں پڑھتی تھی، وی سی آر پر انڈین فلمیں دیکھتی تھی، انگریزی ناول پڑھتی تھی لیکن پھر بھی وہ اپنے طبقے کی دوسری لڑکیوں سے مختلف تھی۔ تمکنت

نے اس کے ذہن کو جانے کس بھوزے میں پالا تھا کہ اس کی معصومیت برقرار رہی
تھی۔ ارم کو دیکھ کر کبھی کبھی مجھے رشک آتا۔ اس کے وجود میں مشرقی رہن سہن اور
مغربی ذہن کا نہایت حسین سنگم ہوا تھا۔

تمکنت کو مچھلیوں کا شوق اچانک ہوا۔ اس شوق کی کہانی بھی عجیب ہے۔ وہ
بنکاک گئی ہوئی تھی اور وہیں اس کی ملاقات ایک مہاپرش پنڈت سے ہوئی جو
بڑے پہنچے ہوئے جوگی تھے اور ساتھ ہی جنم کنڈلیاں بڑے اہتمام سے کھینچتے
تھے۔ تمکنت نے ان سے اپنی جنم کنڈلی بنوائی اور یوگا کے آسن سیکھے۔

بات یہیں پر ختم ہو جاتی اگر تمکنت کے اندر ایک رگ زیادہ نہ ہوتی۔ مہا
پُرش پنڈت سے ملنے کے بعد تمکنت کی تمام دلچسپیاں جوتش ودّیا پر مرتکز ہو
گئیں۔ جوتش ودّیا پر کتابیں خرید خرید کر اس نے ڈھیر کر لیں۔ میں اس سے ملتی تو
وہ ستاروں کی چال، بروج اور ان کے خواص، جنم کنڈلی، جنم راس، نچھتر،
بدّ، دشا، ساڑھ ستی کی باتیں کرتی۔

اُنہی دنوں تمکنت سے ملاقات ہوئی تو کیا دیکھا کہ گلے میں ایک سنہری
زنجیر ہے اور زنجیر کے وسط میں دو مچھلیاں ہیں جو ہنسلی کی ہڈی کو چومتی ہیں۔
میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔؟ تو کہنے لگی "میرا Sun Sign ہے،
امریکہ سے منگوایا ہے۔"

چند ہفتوں بعد ملاقات ہوئی تو سونے کی دو مچھلیاں گلے کا ہار تھیں اور
ان گنت مچھلیاں اردگرد تھیں۔ گھر اچھا خاصا ایکوریم بن چکا تھا۔ اسد نے
فریاد کی، وہ تمکنت کی انتہاپسندی سے عاجز تھا۔ مچھلیاں اس کا من بھاتا
کھاجا تھیں اور تمکنت کو مچھلی سے اب وہی پرہیز تھا جو کسی جینی کو ماس
سے ہوتا ہے۔

انہی دنوں عید آئی اور میں عید ملنے اس کے گھر گئی تو وہ گلے ملی پھر اس نے چاندی کا خاصدان میری طرف بڑھایا جس میں چاندی ہی کی ایک نہایت حسین اور سبک مچھلی رکھی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس مچھلی کا کیا کروں۔ وہ میری الجھن سمجھ گئی، اس نے مچھلی اٹھا کر کوئی کھٹکا دبایا اور مچھلی کا منہ کھل گیا۔ یہ چاندی کا مچھلی نما عطر دان تھا۔ اتنا حسین اور منفرد عطر دان میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا مجھے عطر لگا کر اس نے مچھلی کا منہ بند کیا تو میں نے اسے ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ اس میں آنکھوں کی جگہ دو ننھے ننھے یاقوت جڑے تھے اور بدن میں وہی لچک، وہی لوچ تھا جو زندہ مچھلی میں ہوتا ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ چاندی کی یہ مچھلیاں کھڑک پور کی خاص صنعت ہیں اور اس نے مونگیر سے منگائی ہیں۔

کوئی اس سے اس کے اس عجیب شوق کے بارے میں پوچھتا تو عجیب دلیلیں نکال کر لاتی، کبھی قصص الانبیاء سے اُس مچھلی کا حوالہ دیتی جس کے مُہرۂ پُشت پہ وہ گائے کھڑی ہے جس نے سات طبق زمین کو اپنے دو سینگوں پر اٹھا رکھا ہے اور جن دو سینگوں کے درمیان چار ہزار سینگ اور ہیں اور جس کے ایک سینگ سے دوسرے سینگ تک کا فاصلہ پانچ سو برس کا ہے۔ اور کبھی اپنی بات کو وزن دینے کے لیے وہ اس مچھلی کا ذکر کرتی جس کے پیٹ میں یونس نبی نے ۴۰ دن اور ۴۰ راتیں گزاری تھیں۔ اُسی کی زبانی مجھے اس مچھلی کا قصہ معلوم ہوا جو دراصل وشنو کا ایک روپ تھی اور جس روپ میں وشنو نے مَنُو کا امتحان لیا تھا۔

راس مین سیارہ نیپچون کے زیر اثر ہے اور نیپچون سمندر کے دیوتا پوسیڈون کا نسبتاً نیا نام ہے۔ وہ اپنے راس کی تمام بنیادی خصوصیات رکھتی تھی۔ مچھلی کی طرح پھسلتی ہوئی، پانی کی طرح مضطرب۔

محفلوں اور مجلسوں میں اپنے برج کے زیر اثر پیدا ہونے والوں کو وہ جانے کس

طور پہچان لیتی اور پھر ان سے فوراً اس کی شناسائی ہو جاتی ۔ اسد کبھی کبھی چڑ کر کہتا۔
"میرا گھر تو Pisces Club ہے۔" تمکنت نے جانے کہاں کہاں سے
اپنے برج کے زیر اثر پیدا ہونے والوں کے نام اور ان کے انجام معلوم کر رکھے تھے۔
کوئین میری آف اسکاٹ اُسے اس لیے محبوب تھی کہ اس کا راشی پھل بھی مین تھا ۔
لوگ نہروں کے شہر دِسے بس اس لیے جاتے تھے کہ وہ دنیا کی حسین ترین اور منفرد
بستیوں میں سے ایک ہے لیکن تمکنت وہاں اس لیے گئی کہ وہ شہر راس مین کے
زیر اثر ہے ۔

اُسے زندگی گزارنے کا سلیقہ آتا تھا، وہ بڑی شاندار دعوتیں دیتی اور بڑی کمال
کی باتیں کرتی۔ پھر ایک دن اس کا فون آیا۔ اسد کو Deputation پر
شرقِ اوسط کے ایک ملک بھیجا جا رہا تھا۔ مجھے سُن کر اداسی ہوئی ۔یوں تو میرے
اور اس کے درمیان کوئی قدر مشترک نہ تھی پھر بھی ہم دونوں کی دوستی بہت گہری تھی۔
وہ "الوداعیہ" کا دعوت نامہ لے کر آئی ۔ یہ آخری دعوت تھی جو اس نے جاتے
جاتے اپنے دوستوں اور اپنے دشمنوں کو دی ۔ میں اس الوداعی دعوت میں نہ
جا سکی، میری اور اس کی آخری ملاقات ایئر پورٹ پر ہوئی ۔

وہ چلی گئی اور مجھے اداس کر گئی ۔ اس سے میرا ملنا کم ہوتا تھا اس کے باوجود
دل کو ایک تسلی سی رہتی تھی کہ وہ شہر میں موجود ہے اور جب جی چاہے گا ملاقات
ہو جائے گی ۔ وقتاً فوقتاً ہم ایک دوسرے کو خط لکھتے رہے ۔ دو سال گزر گئے
اور پھر ایک دن اچانک کسی اطلاع کے بغیر تمکنت مجھ سے ملنے چلی آئی ۔ میں اسے
دیکھ کر حیران رہ گئی کیوں کہ چند ہی دنوں پہلے اس کا خط مجھے ملا تھا اور اس میں تمکنت نے
اپنے آنے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت مضطرب اور الجھی
ہوئی ہے ۔ پہلے تو وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی پھر اچانک "کُھل گئی ۔

اس نے بتایا کہ جس ملک میں وہ مقیم ہے اس کے ولی عہد نے کسی ضیافت میں ارم کو دیکھا اور پسند کر لیا۔ چند ہفتے بعد شاہی خاندان کی طرف سے باقاعدہ خواستگاری کی گئی۔ اب صورت حال یہ تھی کہ اقرار بھی مشکل تھا اور انکار بھی۔

تمکنت اس شادی کے حق میں ہرگز نہ تھی لیکن مسئلہ ارم کا تھا۔ اس کے لیے پریوں کی کہانیاں سچ ثابت ہو رہی تھیں۔

"تم خود سوچو کہ اگر ہم ارم کی عمر کے ہوتے اور ہمارے لیے کسی شہزادے یا کسی راجکمار کا رشتہ آتا تو ہمارا کیا حال ہوتا۔ بس وہی حال ارم کا ہے۔ لیکن میں ان شہزادوں کو خوب جانتی ہوں، جس دن تیل ختم ہو جائے گا ان کی شہزادگی اور ریاستیں سب دھری رہ جائیں گی۔ میں دو سال سے ان کے درمیان ہوں اور ان کے لچھن دیکھ رہی ہوں۔" وہ اسی طرح کی باتیں کرتی رہی پھر چلی گئی۔

دو دن بعد اس کا فون آیا۔ "میں واپس جا رہی ہوں، تم سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ اسد کا فون آیا تھا کہ ان لوگوں نے یاد دہانی کی ہے اور اب بات ٹالی نہیں جا سکتی۔ میں اس مسئلے پر سوچنے کے لیے آئی تھی لیکن کچھ زیادہ ہی الجھ کر جا رہی ہوں۔"

وہ چلی گئی اور میرے دل میں ایک خلش سی رہی۔ چند ہفتے بعد اس کا چار سطری خط آیا۔ "میں نے ہاں کر دی ہے۔ شادی تین مہینے بعد ہے۔ یہ چند سطریں اس لیے لکھ رہی ہوں کہ دو چار دن میں اخباروں کے ذریعے یہ خبر تم تک پہنچنے سے پہلے میرا خط پہنچ جائے۔ تم یہ نہ کہو کہ عجب بے مروّت تھی۔"

خط پڑھ کر میرا جی کچھ بہت زیادہ خوش نہ ہوا لیکن پھر بھی میں نے مبارک باد کا ایک تار اُسے اور اسد کو اور دوسرا ارم کو بھیجا۔

اس کے بعد اخباروں میں سنسنی خیز خبریں آنے لگیں۔ ارم کی اور ولی عہد کی

تصویریں، تمکنت اور اسد کی تصویریں. کراچی کے اس گھر کی تصویر جس میں یہ مختصر سا خاندان رہتا تھا. غرض یہ کہ اس رشتے کے سرکاری اعلان کے ساتھ ہی ارم اور اس کے ماں باپ انٹرنیشنل سیلے بریٹی بن گئے تھے اور اب ہر شخص یہ ثابت کرنے پر تُلا ہوا تھا کہ اس خاندان کا قریب ترین دوست بس وہی ہے۔

شادی موسمِ بہار میں ہوئی. تمکنت نے از راہِ محبت شادی کا دعوت نامہ مجھے بھیجا اور خط بھی. لیکن میری یہ حیثیت نہ تھی کہ ہزاروں روپے خرچ کر کے اس شاہی تقریب میں شریک ہو سکتی. میں نے ارم کو اپنی دعائیں بھیجیں اور اپنی حیثیت کے مطابق دلہن اور دولہا کو ایک چھوٹا سا تحفہ بھیجا. مجھے معلوم تھا کہ اس تحفے کی قدر و قیمت بس تمکنت کے دل میں ہو گی، ورنہ تو یہ تحفہ، تحائف کی صف میں سب سے آخر میں جگہ پائے گا۔

اخباروں، رسالوں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے وسیلے سے پورا ملک اس شادی میں شریک تھا، سو میں بھی تھی۔

شادی ہوئی پھر شاہی جوڑا ہنی مون کے لیے یورپ اور امریکہ کے سفر پر روانہ ہو گیا۔

چار دن، چھ دن، ہفتہ، دو ہفتے، وقت گزرتا گیا، لوگ اس شادی کو بھولنے لگے. میں بھی اپنے معاملات میں الجھی رہی، یوں بھی مجھے شہزادے اور شہزادیاں "باغ و بہار" اور "آرائشِ محفل" کے صفحوں پر تو اچھے لگتے ہیں کہ ان کی سبھا سجی رہے اور ان کی دھوم مچی رہیں لیکن حقیقی زندگی میں یہ لوگ مجھے محض گھناؤنے، محض غلط نظر آتے ہیں. دوسروں کا حق مارتے ہوئے، دوسروں کی آرزوؤں کے خون سے اپنے خوابوں کے محل کا گارا گوندھتے ہوئے۔

ڈیڑھ دو مہینے گزرے تھے کہ اچانک ایک رات خبر آئی کہ پاکستانی شہزادی

ارم کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ مجھ پر بجلی سی گر پڑی، تمکنت کی حالت کے بارے میں سوچ سوچ کر دل کٹتا رہا۔

دوسرے روز خبر آئی کہ میت سوئٹزرلینڈ سے ریاست لائی جا رہی ہے۔ ٹی وی پر ایک بار پھر میں نے ارم کا سفر دیکھا۔ وہ مجھے بیٹیوں کی طرح عزیز تھی۔ میں نے اس کی شادی کی فلم دیکھی تھی۔ ہنستی ہوئی، چہرے پر گلال بکھرا ہوا۔ اسد، فخر سے تنی ہوئی گردن۔ تمکنت، مسرت اور اندیشوں کا مرقع۔

پھر میں نے ٹی وی کیمرے کی آنکھ سے دیکھا، کسی قیمتی لکڑی کے تابوت میں لگا ہوا شیشہ، اس میں سے جھانکتا ہوا سویا ہوا چہرہ، کفن میں لپٹا ہوا بدن۔ پس منظر سے تلاوت کی آواز آ رہی تھی۔ ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی سیاہ پوش تمکنت۔ سر جھکائے ہوئے اسد جو اپنے یونیفارم میں تھا، اپنے سفید لبادے کو سنبھالتا ہوا شہزادہ۔

میرا جی چاہا کہ تمکنت میرے سامنے ہو اور میں اسے سینے سے لگا کر دھاڑیں مار کر روؤں۔ لیکن تمکنت وہاں نہیں تھی، وہاں تو بس کروڑوں نقطے تھے، پیچیدہ مشینیں اور نازک آلات جن کی ترسیل کر رہے تھے۔ میرے اور میری طرح دوسرے لاکھوں افراد کے گھروں میں رکھے ہوئے ٹی وی سیٹ ان کروڑوں نقطوں کو وصول کر رہے تھے، تمکنت کی شبیہ مرتب کر رہے تھے۔ میں ان کروڑوں نقطوں کو بھلا کیا پرسہ دیتی، انہیں کیا گلے لگاتی۔

میں تمکنت کو پرسے کا خط بھی نہ لکھ سکی۔ مجھے لکھے ہوئے بے جان، بے روح اور سرد الفاظ سے نفرت ہے، پھر میں انہیں لکھ کر کیا کرتی۔

کئی مہینے گزر گئے، پھر میں نے ایک دن کسی سے سنا کہ تمکنت لوٹ آئی ہے، اس کا شدید نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا اور ڈاکٹروں نے وطن کی آب و ہوا نسخے میں لکھی تھی۔

اس کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ کس طرح اس کے سامنے جاؤں گی،
اس سے کیا کہوں گی۔ میں نے کئی دن اسی شش و پنج میں گزارے لیکن اس سے
ملاقات کو آخر میں کب تک ٹال سکتی تھی۔

وہ گھر جو کبھی خوشیوں سے چھلکتا ہوا قہقہوں سے مہکتا ہوا ہوتا تھا، اب
سرد سامان سے بھرا ہوا محض ایک مکان رہ گیا تھا۔ میری ہمت نہ ہوئی کہ اُسے
گلے لگاؤں، اس سے کچھ کہوں، اُس سے کچھ پوچھوں۔

وہ مجھے ایک ٹک دیکھتی رہی، اس کی آنکھوں میں وہ ٹھہراؤ تھا جو طوفان
زدہ سمندروں کے سینے میں ہوتا ہے۔ پھر وہ باتیں کرنے لگی، کچھ بامعنی، کچھ
بے ربط باتیں، ہم دونوں نے ارم کا نام تک نہ لیا۔ ہم شاید اس کے نام سے،
اس کے ذکر سے ڈرتے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں ملازم نے آکر کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ تمکنت اور میں
دونوں اٹھ کر ڈائننگ روم میں چلے گئے۔ اسد کہیں گیا ہوا تھا اور گھر ہر
چیز کے ہوتے ہوئے بھی بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

میز پر کئی چیزیں تھیں اور ایک قاب میں تلی ہوئی مچھلی کے ٹکڑے تھے۔
میں حیرت سے اس قاب کو اور تلی ہوئی مچھلی کے ٹکڑوں کو دیکھتی رہی۔ مہاپرش
جوگی سے ملنے کے بعد تمکنت کو مچھلی سے آخری درجے کا پرہیز ہو گیا تھا پھر یہ
کایا پلٹ میری سمجھ میں نہ آئی۔ میری آنکھوں میں یقیناً بہت سے سوال رہے
ہوں گے، تب ہی تمکنت نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا" تم لوگ قبروں کی تعظیم تو
کرتے ہو نا؟ پھر اگر میں اپنی تیرتی ہوئی ممکنہ قبروں سے ڈرتی تھی، ان کا احترام
کرتی تھی تو کیا غلط تھا؟ رشی جی نے مجھ سے کہا تھا کہ بڑی مچھلی تمہیں کھالے گی،
تب میں سمجھی تھی کہ میری موت شاید سمندر میں ڈوب کر ہو گی، میں مچھلیوں سے

ڈرنے لگی تھی، مجھ سے چُوک تو بس یہ ہوئی کہ رشی جی کی بات سمجھ نہ پائی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ انہوں نے جس بڑی مچھلی کا ذکر کیا ہے وہ ریگ زارِ عرب میں پل رہی ہے۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے کیا کہوں۔ اس کے اندر بڑے خوفناک زلزلے آئے تھے اور ان زلزلوں نے اس کے وجود کی پرتیں الٹ پلٹ کر رکھ دی تھیں۔

"عجیب خوف تھا تمہارا کہ جس کے سبب تم نے ہزاروں روپے برباد کیے اور خوب تھے تمہارے رشی جی بھی۔" میں نے چاہا کہ وہ کوئی اور بات کرے۔ قبروں کے اور موت کے ذکر سے میں گریز ہی چاہتی تھی۔

"میری جان، بربادی اور آبادی بڑی اضافی باتیں ہیں۔ ایک کی آبادی دوسرے کی بربادی ٹھہرتی ہے۔ ایک کی جان جاتی ہے تو دوسرے کی بھوک مٹتی ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ زندگی سے بہتر ایکوریم ہیں۔ ان میں پلنے والی مچھلیاں ٹکڑوں میں بانٹ دی جاتی ہیں۔ چھوٹی اور بڑی مچھلیاں الگ الگ رکھی جاتی ہیں۔ صرف ایکوریم ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں کوئی بڑی مچھلی، کسی چھوٹی مچھلی کو نگل نہیں سکتی۔"

اس کی گفتگو سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن میں سب سے اہم مسئلہ بس یہی ہے کہ سمندر میں اور دریا میں خانے کیسے بنائے جائیں، چھوٹی مچھلیوں کو بڑی مچھلی سے الگ کیسے رکھا جائے۔

میں اس کا دھیان ہٹانے کے لیے اُس سے اپنی بے خوابی کا ذکر کرنے لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے کچھ دواؤں کے نام بتائے گی۔ اُن Tranqulisers یا Sedatives کا تذکرہ کرے گی جو خود اس کے زیرِ استعمال تھیں۔ لیکن کوئی دوا تجویز کرنے کی بجائے اس نے اچانک ایک نہایت غیر متعلق سوال کیا۔ کہنے لگی۔

"تمہیں وہ گنڈولا یاد ہے جو میں تمہارے لیے وینس سے لائی تھی؟"

"وہ میرے ڈرائنگ روم میں آج بھی رکھا ہوا ہے۔ کبھی اس کا رنگ کجلانے لگتا ہے تو میں Silvo سے اُسے گھنٹوں اُجالتی ہوں۔" یہ بڑی غنیمت بات تھی کہ اس نے خود ہی دوسرا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ Tranqullisers کا ذکر نہ سہی، گنڈولے کی باتیں سہی۔

"جب میں تمہارے گھر آؤں گی تو تمہیں اُس گنڈولے میں بیٹھنے والے کو دکھاؤں گی۔" اس نے نیپکن تہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن گنڈولا تو خالی ہے، تم مجھے اس میں بیٹھنے والا کہاں سے دکھاؤ گی۔" میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"تم نے اسے غور سے نہیں دیکھا، آج رات جب سب سو جائیں تو بجلی بند کر دینا پھر اسے غور سے دیکھنا، اس میں تمہیں وقت بیٹھا ہوا نظر آئے گا۔ میرے کمرے میں جو گنڈولا ہے، وہ اس میں بیٹھا رہتا ہے۔ راتوں کو جب مجھے نیند نہیں آتی تو میں اٹھ کر اسے دیکھتی ہوں۔ وہ گذران کی ڈور لیے بیٹھا رہتا ہے اور پیہم شکار کرتا ہے۔ بڑا شکار، چھوٹا شکار۔ اُس نے اپنی ڈور میں ہونے کا چارا لگا دیا ہے اور جب تم یا میں، یا ہم سب اس چارے کو نگل لیتے ہیں تو اسی لمحے سے ہمارے نہ ہونے کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ کسی مشاعرے میں ایک دوہا سنا تھا، پہلا مصرعہ یاد نہیں، دوسرا مصرعہ کچھ یوں تھا کہ "مچھلی بچ کر جائے کہاں جب جل ہے سارا جال"۔ اس وقت یہ مصرعہ سمجھ میں نہ آیا تھا، پھر جب میں نے اپنے گنڈولے میں بیٹھے ہوئے وقت کو دیکھا تب یہ بات سمجھ میں آئی۔ معاملہ کچھ یوں ہے کہ بڑی مچھلی، چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ وقت اعداد میں بٹی ہوئی اپنی شباہتوں کو کھاتا ہے۔ میں وقت کا کھاجا ہوں۔ کاش میری ماں اور میرے باپ نے مجھے ہونے کا چارا نگلنے پر مجبور نہ کیا

ہوتا، کاش اس رات وہ ایک دوسرے کی طرف سے منہ موڑ کر سوتے جب میرے نہ ہونے کے سفر کا آغاز ہوا تھا۔"

وہ کسی زومبی کی طرح بول رہی تھی۔ لفظ اس کے ہونٹوں سے یوں گر رہے تھے جیسے پت جھڑ میں پتے پیڑ سے گرتے ہیں۔ میرا دل بھر آیا، میں کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھانا ہم دونوں میں سے کسی نے نہیں کھایا تھا، بس ایک رسم تھی سو پوری ہو گئی تھی۔ زندگی بھر ہنسانے والی اب اپنی بہکی بہکی باتوں سے رُلا رہی تھی۔

میں اُسے پُرسہ دینے آئی تھی لیکن میرے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا تھا۔ اس نے شاید میری لبریز آنکھیں دیکھ لیں، تب وہ میرے قریب آئی اور پرانے دنوں کی طرح اس نے میرے دونوں شانے تھام لیے۔ انگلیوں کی گرفت میں شدت تھی، لہجے میں تپش تھی۔

"تم نے ارم کے بارے میں کچھ نہ پوچھا مجھ سے"۔ اس کے لہجے میں شکایت نہ تھی، بس ایک کھوکھلا بیان تھا۔

میں ضبط نہ کر سکی، میں نے اُسے دیکھا اور گردن جھکا لی، آنسو آنکھوں کی قید سے آزاد ہو گئے۔

اس نے مشتری کی انگلی سے میرے ایک آنسو کو چھوا۔ "سب مجھ سے اس کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کچھ تم بھی تو پوچھو۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"کیا پوچھوں۔ اب پوچھنے کو بھلا کیا رہا ہے؟" میری آواز میں گہری نمی تھی۔

"ابھی تو سب کچھ پوچھنے سے رہ گیا ہے۔ مثال کے طور پر تم یہی نہیں جانتیں کہ میں Achilles تھی اور وہ Achilles Heel ناقابلِ تسخیر بدن میں قابلِ تسخیر حصۂ بدن۔ جانتی ہو Achilles Heel کا دوسرا نام کیا ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"Achilles Heel کا دوسرا نام چھوٹی بہلی ہے۔"

میرا جی چاہا کہ چیخیں ماروں، اُسے کیا ہو گیا تھا، یہ سب کچھ کیا ہو رہا تھا۔

"تم نے Kama Sutra پڑھی ہے؟"

"تم شاید ہوش میں نہیں ہو" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ اس نے میری جھنجھلاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

"ہاں۔"

"اور انگارنگا؟"

"ہاں، وہ بھی۔"

"ادیارشتکا جانتی ہو؟"

تمکنت کا ذہنی توازن واقعی ختم ہو چکا تھا۔ یہ دیوانوں کی باتیں تھیں جو وہ کر رہی تھی۔ اس نے مجھے خاموش دیکھ کر پھر پوچھا۔ "ادیارشتکا جانتی ہو؟"

اور میں اقرار کرتے ہوئے جھینپ سی گئی۔

"راجپوت مہاراجوں نے کھجراہو میں شیو اور وشنو کے لیے جو متھن مجسمے بنوائے تھے وہ دیکھے ہیں؟"

"وہ مندر نہیں دیکھے، ان کی تصویریں اور ان کی Tablets دیکھی ہیں لیکن خدا کے لیے کچھ اور باتیں کرو، تمہیں آخر کیا ہو گیا ہے۔" میرے لہجے میں اب تلخی جھلکنے لگی تھی۔

"مندروں اور مجسموں کی باتیں نہیں کرتیں، نہ کرو۔ اپنی اور میری بات کرو کھیت اور کھلیان کی بات کرو۔" وہ یوں ہنسی جیسے اندھے کنوئیں میں ابابیلیں چکرا رہی ہوں۔

"اب تم کھیت کھلیان کے چکر میں پڑ گئیں، کوئی بات تو ٹھکانے کی کرو۔" میں نے اُلجھ کر کہا۔

"میں بے ٹھکانہ بات تو نہیں کر رہی۔ تم پڑھی لکھی ہو تمہیں تو نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم عورتیں مَردوں کی کھیتیاں ہیں اور میری جان کھیتیاں تو بس اپنے مالک کے رحم و کرم پر ہوتی ہیں۔ مالک جس طرح چاہے ان میں جا سکتا ہے۔"

"مجھے کھیتیوں سے دلچسپی ہے، نہ ان کے مالکوں سے۔ خاک ڈالو ان سب پر۔ مجھے ارم کے بارے میں بتاؤ، اخباروں میں تو حادثے کی کوئی تفصیل نہیں آئی تھی۔"

"کھیتیاں جب مرتی ہیں تو ان کی موت کی تفصیل اخباروں میں نہیں آتی، میری ارم بھی تو محض کھیتی تھی۔" اس کی آواز سسکی سے مشابہ تھی۔

میرا سر چکرانے لگا تب اچانک مجھے احساس ہوا کہ ارم کی موت سے سوا بھی کوئی بات ہے۔ کوئی ایسی بات جس نے تمکنت کے اندر کا توازن ختم کر دیا ہے۔ "تمکنت کچھ تو بتاؤ، کچھ تو کہو۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیے۔

"میری جان تمہارے خیال میں کیا وہ کہانیوں کی شہزادی تھی کہ اس کی کہانی کا اختتام And They Lived Happily Ever After پر ہوتا؟

میں نے تو اسے زندگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ اپنے آپ کو سینڈرلا اور زندگی کو شیشے کی جادوئی گرگابی سمجھ بیٹھی تھی۔"

وہ الجھی الجھی بہکی بہکی باتیں کرتی رہی اور جب اس کی الجھی الجھی باتوں کی ڈور سُلجھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ سمجھ دار وہ ہے اور نا سمجھ میں ہوں۔ اس کے ٹوٹے ٹوٹے جملے، اس کی بے ربط باتیں، میں ان کو جوڑتی گئی، سمجھتی گئی اور خود اپنے اندر مرتی گئی کہ بس یہی میرے بس میں تھا۔

ارم کو شادی کے بعد اندازہ ہوا کہ کسی عرب شہزادے کی بیوی بننا کوئی ہنسی

ٹھنڈول نہیں۔ وہ اس کی منکوحہ تھی اور عرب شہزادے کے بقول وہ اس کی کھیتی تھی
اور کھیتی اس بات کی مجاز نہیں کہ وہ ہل چلانے والے کو اس بات پر ٹوکے کہ ہل کھیتی
کے آغاز سے چلایا جائے یا اختتام سے۔ شارلٹ برونٹے، مارگریٹ مچل اور ملیا سکیٹ
کے ناول پڑھنے والی ارم کا ذہن رومان کے دھندلکوں اور سریت کی تہ داریوں میں
چھپی ہوئی جنس کے خواب دیکھتا تھا۔ یہ اس کی ماں کی غلطی تھی کہ اُس نے اپنی بیٹی کو کام
شاستر اور اننگ رنگ نہیں پڑھوائی تھیں، کھجراہو اور بھوانیشور کے مجسمے نہیں دکھلائے
تھے اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ آلِ سدُوم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا
جو اپنی محبوباؤں اور اپنے محبوبوں کو یکساں برتتے تھے۔

جب ارم نے سارا کھیل دیکھ لیا تب اس نے ایک خط ماں کو لکھ کر روانہ کیا
اور جان کے عوض آزادی خرید لی کہ بہرحال مرجانا آسان تھا اور زندگی کرنا مشکل۔
اس کا تابوت پہلے آیا، خط بعد میں پہنچا۔ وہ منو تو نہ تھی کہ کوئی وشنو مچھلی کے
روپ میں آتا اور اُسے بچالیتا۔

میری بیٹی مجھے دور سے آواز دے رہی ہے۔ وہ خاصا آگے نکل گئی ہے اور
میں ابھی تک Achilles Tang کے سامنے کھڑی ہوں۔ سمندری پانی ہلکورے
لے رہا ہے انڈو پیسیفک کی باسی رسان رسان تیر رہی ہے۔ یہاں یہ چھوٹی
مچھلیوں کو نہیں کھا سکتی، یہاں یہ بڑی مچھلیوں کا نوالہ نہیں بن سکتی۔

میں دل کر اپنی بیٹی کو دیکھتی ہوں اور ایک ایسے ایکوریم کی خواہش کرتی ہوں جہاں
وہ نہ چھوٹی مچھلی کو نگل سکے اور نہ بڑی مچھلیوں کا نوالہ بن سکے۔

ساتویں رات

رات آسمانوں سے اترتی ہے۔ انجیر کے درختوں، انگور کی بیلوں اور بید مجنوں کی شاخوں پر آرام کرتی ہے۔ میرے چاروں طرف روشنی کا سراب ہے، بہت سی خوشبو ہے، سرسراتے ہوئے لمس ہیں۔ ان دیکھی راحتیں اور بن چکھے عذاب ہیں۔

یروشلم کی بیٹیو! میں سوچتی ہوں کہ کسی شام، رات، کی طرح آسمانوں سے اتروں اور بنفشہ کے پھولوں پر گیہوں کی بالیوں پر، بپھرے ہوئے سمندر پر آرام کروں۔ پھر وہ لمحہ آئے کہ آرام کا جھاگ رؤئیں رؤئیں میں اتر جائے۔ بپھری ہوئی موجوں کا عذاب رگ رگ میں پھیل جائے اور میں شانت ہو کر سو جاؤں۔ مگر یروشلم کی بیٹیو مجھے نیند نہیں آتی اور نیند آئے بھی تو کیسے؟

یہاں اتنی بہت سی روشنی ہے، خواہش کی منڈیر پر نخوت اور انا کے چراغ جھلملاتے ہیں۔ ان چراغوں کی لَو دھیمی ہو، ان کی روشنی ماند پڑے تو شاید میری آنکھیں نیند کی شبنم سے بھیگ جائیں۔ لیکن وہ لمحہ آج تک نہیں آیا جب ان چراغوں کی لَو مدھم ہو، ہر طرف لمس کا ریشم بچھے، لمحے اندھے کنوئیں میں

اتریں اور رات کو چین آئے۔

میں اس لمحے بھی جاگ رہی ہوں اور رات میرے پہلو میں ہے۔ یروشلم کی بیٹیو! کاش تم جان سکتیں کہ رات کا گرم، نرم اور سنولائی ہوئی خوشبو سے مہکتا ہوا بدن کس قدر دلآویز اور جان لیوا ہے۔ یہ کیسے متضاد دعوے ہیں، لیکن ایک دوسرے سے کس طرح پیوستہ ہیں۔ انہی دو متضاد حالتوں نے مجھے اور رات کو یکجا کیا ہے۔

بے شمار لمحوں نے پہلو بدلا ہے اور ہوا میں لپٹے ہوئے پتوں کی طرح شمال سے جنوب کی طرف اُڑتے چلے گئے ہیں۔ ان کی اُڑان کی سنسناہٹ کے ساتھ دو بول گونجتے ہیں۔ کونل کوکت ڈار ڈار اور گوری کرت سنگھار۔ بسنت کی خوشبو سے مہکتے ہوئے یہ بول نخن والقمر جیران کی نیم مشرقی اور نیم مغربی دھن میں گھل گئے ہیں۔ موسیقی تالاب کے چھلکتے ہوئے کناروں سے بہنے لگی ہے۔ میرے ہاتھ میں خفی سی لرزش ہے۔ سنہرے رنگ کے مشروب سے لبریز اور برف کی سفید ڈلیوں سے کھنکتا ہوا گلاس اپنے کناروں سے چھلک گیا ہے۔ میرے پیروں کے نیچے شبنم ہے اور شبنم گھاس پر بچھی ہے۔ تالاب میں پانی ہلکورے لے رہا ہے نخن والقمر جیران کی سحر آگیں لہریں کبھی اوپر اٹھتی ہیں، کبھی تھک کر سمندر سے لپٹ جاتی ہیں اور کبھی پلٹ کر ساحل کی طرف آتی ہیں۔

چاندرات کے شامیانے میں آویزاں ہے اور تنہا ہے۔ میں عشق کی منزل میں ہوں اور تنہا ہوں۔ عشق کا شعلہ بھڑکتا ہے اور مشک کی خوشبو مجھے اپنے حصار میں لیتی ہے۔ روشنی ہے، خوشبو ہے، تنہائی ہے اور میں ہوں۔ میری ہتھیلیاں روشن ہیں، مشتری کی انگلی کے اُبھار پر موجود حلقۂ سلیمان نے میرے وجود کو اپنے حلقے میں لے لیا ہے۔ درویش حلقہ باندھتے ہیں اور سینے پر ہُو کی ضرب لگتی ہے۔ تنہا ہُو، یا ہُو۔ تنہا ہُو یا ہو۔ میری نگاہیں

حلقۂ سلیمان پر قائم ہیں اور میں عالمِ رویا میں ہوں۔ درویشوں کی آواز منارے کی طرح بلند ہوتی ہے۔ مرضی مولا، از ہمہ اولیٰ، عشق ہمارا مولا ہے، عشق ہمارا مولا ہے۔ آوازوں کا اور نعرۂ ہُو کا ہجوم ہے۔ میں لحظہ، رمقہ، ہوا، ودّ، خلّت اور حبّ کی منزلیں طے کرتی ہوئی ساتویں منزل تک پہنچتی ہوں۔ میں عشق تک پہنچتی ہوں اور عشق جہنّم کے دَر کھول دیتا ہے۔

جہنّم کا دَر کھلتا ہے اور شعلے میری طرف لپکتے ہیں۔ یہ شعلے نظر نہیں آتے لیکن روح کو چاٹ جاتے ہیں۔ یہ ایسی تپش ہے کہ انسان کا وجود جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ کوئی دھیمے دھیمے بولتا ہے۔ کسی کی آواز تالاب میں کنکر پھینکتی ہے۔ لکڑی جل کوئلہ بھئی اور کوئلہ جل بھئی راکھ، میں برہن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ۔

نہ کوئلہ ہے نہ راکھ ہے اور نہ میں ہوں ۔ بس ایک عالمِ ہُو ہے۔ تنہا ہُو یا ہُو۔ لفظ اور لفظوں کی ادائیگی، چہرے اور چہروں کے خدوخال۔ یہ سب کچھ سماعت اور بصارت کا سراب ہے۔ یہاں کوئی نہیں بولتا، سب خاموش رہتے ہیں۔ یہاں بولنے والے دھول بن کر اُڑ جاتے ہیں۔ اور سننے والے پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ یہاں کچھ نہ کہو کہ کچھ کہنا اپنے سینے سے دشمنی ہے اور یہاں کچھ نہ سنو کہ سُننے کی سزا پتھّر کی قید ہے۔

ہر سزا میرے علم میں ہے اور ہر عذاب میرے نصیب میں ہے۔ لیکن یروشلم کی بیٹیو! سزا کو پہنچنے سے پہلے میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ میں نے پہلے بھی تم سے بہت کچھ کہا تھا اور اب بھی میں تم ہی سے کہتی ہوں۔ میں تم سے پوچھتی ہوں کہ میں کب نہیں تھی اور کہاں نہیں تھی اور اے یروشلم کی بیٹیو تم کب نہ تھیں اور کہاں نہ تھیں۔ صیہون کی پہاڑیوں سے موآب کی وادیوں تک، کنعان سے سامرہ کی بستیوں تک، اور پھر اس کے بعد بھی ہم کہاں کہاں نہ رہے — دشت و صحرا میں، شہر و قریہ میں۔
یروشلم کی بیٹیوں کا اور شولمیت کا ساتھ قدیمی ہے۔ تمہارا اور میرا ساتھ پرانا ہے۔

میں کہتی رہی ہوں۔ تم سنتی رہی ہو۔ تمھیں سلیمان نے پکارا ہے۔ تمھیں شولمیت نے آوازیں دی ہیں۔ تم شولمیت اور سلیمان کے نامکمل مثلث کی تکمیل ہو۔ اور تم کہ اس تکون کی تکمیل ہو، اس کی آخری لکیر ہو، دیکھو کہ دو مثلث باہم پیوستہ ہیں، ایک وصل کا اور ایک فراق کا مثلث ہے۔ ہزاروں برس پہلے میں آگ تھی اور وصل کے راستے پر گئی تھی، آج میں آب ہوں اور ہجر کا راستہ اختیار کرتی ہوں۔

یروشلم کی بیٹیو! تم وصل میں میرے ساتھ تھیں اور ہجر میں بھی میں تم ہی کو پکارتی ہوں۔ دیکھو کہ جب وصل کے مثلث سے فراق کا مثلث ملتا ہے تو خاتم سلیمان وجود میں آتی ہے۔ یہ خاتم مجھے اپنا چہرہ دکھاتی ہے تو میرے وجود میں شعور اور غیر شعور کا قران ہوتا ہے اور میں درویشوں کے اس حلقے میں شامل ہو جاتی ہوں جو دنیا کی لذتوں سے رشتہ توڑتا ہے اور لحظہ، رمقہ، ہوا، ود، خلت اور حُبّ کی منزلوں سے گزر کر عشق کی منزل تک پہنچتا ہے لیکن وصل کی راہ سے منہ موڑ لیتا ہے۔

میں درویشوں کے حلقے میں شامل ہوتی۔ میں وصل کی شبنم سے بھیگی ہوئی ردا اتار چکی ہوں، میرے بدن پر نخوت کا لبادہ ہے۔ میں اپنا پُرغرور سر اٹھاتی ہوں اور افق کی طرف نگاہ کرتی ہوں۔ یروشلم کی بیٹیو! تم کہ شولمیت اور سلیمان کے نامکمل مثلث کی تکمیل ہو، تم بھی افق کی طرف نگاہ کرو اور دیکھو کہ سلیمان کا رتھ چلا آتا ہے۔ "وہ بیابان سے دھوئیں کے ستون کی مانند چلا آتا ہے۔" وہ شہسواروں کی سی شان سے آتا ہے، مسافروں کی سی تیزی سے آتا ہے اور محبوبوں کی سی عشق انگیزی سے آتا ہے۔

میں اس کا سورج کی طرح روشن چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں لیکن میں اس کی طرف سے منہ پھیر لیتی ہوں۔ میں اس کے عشق کی بیمار ہوں پر میرا عشق مغرور ہے۔ اس شوربخت نے انکسار نہیں سیکھا، اسے نیازمندی کے اور سپردگی کے آداب نہیں آتے۔ میں اس شخص سے منہ پھیر لیتی ہوں۔ میں اس کے وجود کو اپنی حساس انگلیوں سے چھونا چاہتی ہوں، مگر

نہیں چھوتی۔ میں سربلند ہوں، میں پُر از غرور ہوں۔ میں اس شخص کی ہنسی نہیں سنتی جو میرے سامنے کھڑا ہے اور مجھ سے مخاطب ہے۔ اس شخص کا پتا میں نے شہر پناہ کے محافظوں سے پوچھا تھا لیکن اب جب کہ وہ میرے سامنے ہے تو میں اس سے نگاہیں نہیں ملاتی، میں اس کے شیر کی ایال جیسے بالوں پر بھی نظر نہیں کرتی۔ میں اپنے آپ سے ڈرتی ہوں عشق نے میرے باطن میں نقب لگایا ہے۔ اور میرے وجود کی بنیادوں میں بارود بچھا دی ہے۔ میں بہت کمزور ہوں، اسی لیے پُر از غرور ہوں۔

یہ شخص مسافر ہے اور نادان ہے۔ اسے کچھ نہیں معلوم۔ وہ میرے غرور کو میری کمزوری نہیں سمجھتا اور میری بے نیازی پر غور نہیں کرتا۔ یہ اس بات سے ناواقف ہے کہ بعض رد میں استعارے اور کنائے برتنے کی عادی ہوتی ہیں۔

میں عشق کی بیمار تھی اور میرا دل پُر آزار تھا۔ وہ شخص کہ جس کا چہرہ میں نے جاگتے میں نہ دیکھا تھا، اسی روشن چہرے کو محو خواب دیکھنے کی خواہش نے مجھے تباہ کر دیا۔ وہ اس کے قیام کی پہلی رات تھی اس رات میں نے اپنے حجرے کی دیوار کو ناخنوں سے کھرچ کر پیازی کاغذ کی طرح کر دیا۔ اور دیوار اتنی شفاف ہو گئی کہ میں دوسری طرف سوئے ہوئے اس روشن چہرے والے کو دیکھ سکتی تھی جس کے شیر کی ایال ایسے بال شیرازی کبوتروں ایسے سفید تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ جس کے چہرے پر خوابوں کی تھکن کا پسینا تھا اور جس کے سینے پر سیاہ انگوروں کے گچھے پھیلے ہوئے تھے۔ تو یوں ہوا کہ میں سیاہ انگوروں کی فصل کو دیکھ کر خواہش کے بوجھ سے نڈھال ہو گئی لیکن یروشلم کی بیٹیو! میں نخوت کا لبادہ پہن چکی تھی۔ اور تم نے بھی مجھے سپر اندازی کے نکات تعلیم نہیں کیے تھے، اس لیے میں اپنے بستر پر گر پڑی اور میں نے گریہ کیا۔

میں نے گریہ کیا، میں نے تمھیں یاد کیا اور گزرے زمانوں کو اپنے اندر دہرایا۔ میں نے سوچا کہ ابھی تو چھ راتیں باقی ہیں۔ اب جب رات آئے گی تو میں اس پیازی کاغذ

کو نوچ کر پھینک دوں گی، پھر نخوت کا لبادہ اتاروں گی اور رات کے دامن سے اپنی عرق آلود پیشانی کو خشک کر کے اس جہان سے اُس جہان تک سفر کروں گی اور اس سفر کے دوران تتلیوں کے رنگ، جگنوؤں کی دمک اور بیر بہوٹیوں کی سرخی دوسرے جہان میں پھیل جائے گی۔

لیکن یروشلم کی بیٹیو! میں تمھیں بتاؤں، ہوا کچھ یوں کہ جب دوسری رات آئی تو میں نے دیکھا کہ میرے اور اس کے حجرے کی درمیانی دیوار پہلے کی طرح سنگلاخ ہے۔ یہ دیکھ کر میں نے تہیہ کیا کہ آج کی رات اس دیوار کو اپنے ناخنوں سے چھیل کر ہی اٹھوں گی۔ وقت کے سمندر پر میرے وجود کی ناؤ آگے کی طرف سفر کرتی رہی، پھر جب میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو دریچے کے باہر صبح کسمسا رہی تھی! اور وہ بستر پہ پہلو بدل رہا تھا۔ کاغذ کی اس دیوار کو ناخنوں سے نوچ کر پھینک دینے کا وقت اب نہیں رہا تھا۔

اسی طرح چھ راتیں گزر گئیں، فراق کی چھ صدیاں، خواہش کے چھ قرن۔ پہلی رات میں لحظہ پہنچی۔ دوسری رات رمقہ سے گزری، تیسری رات ہوا کے ساتھ گزاری۔ چوتھی رات ودّ میں بسر ہوئی۔ پانچویں رات خلت میں ٹھہری اور چھٹی رات میں نے حُبّ میں قیام کیا۔

دن کاغذ کی دیوار کو سنگلاخ سے بدل دیتا اور رات بھر انگلیاں لہولہان کرنے کے بعد جب وہ سامنے ہوتا اور میرا وجود خواہش کے عذاب سے ہلکان ہو جاتا تو دشت وبیاباں سے 'تنتنا ہُو یا ہُو' کی آواز آتی اور میرا دامن تھام لیتی۔ اسی طرح یہ چھ راتیں گزر گئیں۔ دن میں نے بے نیازی کے عالم میں بسر کیے اور راتوں کو جب میں نے اس کی طرف سفر کرنا چاہا تو وہ مجھ سے بے خبر اپنے بستر پر سوتا رہا اور اس کے چہرے پر خوابوں کی دھند پھیلتی رہی۔

رات اندھے کنویں کی سیڑھیاں اتر رہی ہے اور آج میرے جاگنے کی ساتویں رات ہے۔ آج کے بعد نہ رات آئے گی اور نہ دن گزرے گا۔ میرے دامن میں قوس قزح کے رنگ کی تتلیاں، یاقوت کی طرح دمکتی بیر بہوٹیاں اور ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے جگنو ہیں۔

لیکن میرے ہاتھ پتھر کے ہیں، میرے لباس کی سلوٹیں پتھر کی ہیں۔ اور میرے پیروں کی جنبش بھی پتھرا گئی ہے۔ یروشلم کی بیٹیو! میں جانتی ہوں کہ آج کی رات کے بعد کوئی رات ایسی نہیں آئے گی جب وہ اس شہر میں ٹھہرے۔ میری انگلیوں سے خون ٹپکتا ہے اور میرا بدن سورج کی تمازت سے دہکتے ہوئے صحرا کی طرح تپتا ہے۔ کاغذ کی دیوار کے اس طرف وہ سو رہا ہے۔ رات ابھی باقی ہے، میں نخوت کا لبادہ اتار کر اور رات کے دامن سے اپنی عرق آلود پیشانی خشک کر کے اس کی طرف سفر کر سکتی ہوں۔ میں چاہوں تو لمحے کے ہزارویں حصے میں یہ دیوار کہیں نہ رہے، ہاں کہیں نہ رہے لیکن پھر خیال آتا ہے کہ دیوار کے آثار پھلانگتے ہی فراق کی یہ گھڑیاں جو بہت جان لیوا اور خوبصورت ہیں گزر جائیں گی۔ یہ ساتویں منزل جو عشق کے نام سے موسوم ہے، منہدم ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہی میرا وجود بھی گرد ہو جائے گا۔

یہ خیال آتے ہی میرا دل بیٹھنے لگتا ہے اس شخص کا فراق مجھے کس قدر عزیز رہا ہے جبکہ وصال تو ایک ایسی شفاف ندی ہے جسے دیکھو تو اس کی تہ میں بچھے ہوئے سنگریزے بھی صاف نظر آتے ہیں۔ یہ ندی اپنے اندر کوئی رمز نہیں رکھتی۔ اور فراق کائنات کے عمیق ترین سمندر کی مانند ہے جس کی گہرائی تک کوئی نہیں پہنچا، میں بھی نہیں پہنچوں گی۔ اس سمندر میں ستاروں کی مانند ان گنت اسرار اور رمز ہیں۔ اس کی تہ سے بیشمار چھوٹے اور بڑے دریا اُبلتے ہیں۔ احساس کے ہزاروں رنگ پھیلتے ہیں اور خیال کی بے حساب خوشبو پھوٹتی ہے۔

میں سوچتی ہوں یروشلم کی بیٹیو کہ ندی میں جھانک کر چند سنگریزوں کو بھلا کیا دیکھوں، یہ تو ان پرندوں کو بھی نظر آجاتے ہیں جو صرف ایک قطرے کے لیے اس ندی میں اپنی چونچ ڈبوتے ہیں۔ مجھے سمندر میں اترنا چاہیے جس کا سینہ فراخ ہے، جس کے ان گنت رُوپ ہیں اور کتنے ہی بہروپ۔ میں لہولہان انگلیوں کو دیکھتی ہوں اور کاغذ جیسی دیوار

کو اور اس بستر کو جس پر ایک نادان آرام کر رہا ہے۔ پھر ساتویں رات کی موت سے پہلے سمندر میں اتر جاتی ہوں۔

یروشلم کی بیٹیو! تم گواہ رہنا کہ تمھاری شولمیت نے عشق کی شراب اپنے سینے میں انڈیلی اور وصل کی مے کو اپنے ہاتھوں سے وقت کی ریت پر بہا دیا۔ میں جانتی تھی کہ :

"عشق موت کی مانند مضبوط ہے
اور غیرت عالم اسفل کی طرح سنگ دل ہے
اس کا بھڑکنا آگ کا بھڑکنا ہے
اس کے شعلے خداوند کے شعلے ہیں
سیلاب عشق کو بجھا نہیں سکتا
طغیانی اس کو ڈبا نہیں سکتی"

یروشلم کی بیٹیو! شولمیت تم سے بڑی گواہی بھلا اور کس کی لائے گی۔ گواہ رہنا کہ میں عشق کی منزل میں ٹھہری۔ پھر ہجر کی راہ اختیار کی اور اب میں کبھی ختم نہ ہونے والے سفر میں ہوں۔

زرد ہوائیں، زرد آوازیں

خوش نما اور مزین گھڑی ہوا سے جھول رہی ہے ۔ اس کے وسط میں بیٹھی کوئل اپنی چونچ کھولتی ہے اور کُوکنے لگتی ہے، ایک، دو، تین ۔ وہ گیارہ مرتبہ کُوکتی ہے پھر خاموش ہو جاتی ہے ۔ میں اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر اسے دیکھتی ہوں ۔ یہ جو ابھی لمحہ بھر پہلے زندہ ہوئی تھی اب پھر خاموش ہو گئی ہے ۔ ساکت و صامت، منجمد ۔

رات کے گیارہ بج گئے حالانکہ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے شام نے ابھی چند ساعت پہلے آنکھ کھولی ہو ۔ دُور سے پٹاخوں کی آواز آ رہی ہے ۔ لڑکے شب برات منانے میں مصروف ہیں ۔ چند گھنٹے پہلے جب میں یہاں آ رہی تھی تو شہر میں آتش بازی چھوٹ رہی تھی، پھلجھڑیاں، پٹاخے، انار ۔ آگ کے پھول ہنستے ہوئے بلند ہو رہے تھے پھر بجھ کر زمین پر گر رہے تھے ۔

انسانوں کا، آوازوں کا، قہقہوں کا اور مداراتوں کا ہجوم ہے پھر بھی کیسی تنہائی ہے جیسے ہُو کا عالم ہو، جیسے یہاں کوئی سانس بھی نہ لیتا ہو، ہجوم تو محض دل بہلاوا ہے اور کچھ بھی نہیں ۔

کھانا ختم ہوئے دیر ہو چکی ہے اب کونیک کا دور چل رہا ہے، بلوریں پیمانوں میں

ارغوانی شراب چھلک رہی ہے۔ سرِ شام سے ہی دوستی کے نام پر، محبت کے نام پر اور زندگی کے نام پر پیمانے خالی ہو رہے ہیں۔ دھیمی آواز میں روی شنکر کی انگلیوں کا جادو جاگ رہا ہے۔ ستار کی جان لیوا آواز سارے کمرے میں پھیلی ہوئی ہے۔ قہقہوں، باتوں اور پیمانوں کی کھنک پر اس آواز کا سایہ ہے۔ طبلے کی آواز سے دل پر چوٹ لگتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کوئی آواز نہ ہو، وحشی رہوار ہو جو دل کو اپنی ٹاپوں سے روند رہا ہو۔

رات کے سناٹے میں ریل کی سیٹی کی آواز کہیں بہت دُور سے آتی ہے اور میرا دل ڈوب جاتا ہے۔ ریل کی آواز مجھے ہمیشہ بہت اداس کرتی ہے۔ دُور جاتی ہوئی، معدوم ہوتی ہوئی آواز۔ بچپن کی عجیب سرّیت آمیز اور دل گرفتہ یادیں ہیں جو اس کی آواز کے ساتھ لپٹی چلی آتی ہیں۔

ریل قبرستان کے پہلو سے گزرتی ہے اور میں ان شکستہ اور پختہ قبروں کو دیکھ رہی ہوں جو ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ دھنسی ہوئی بے چراغ قبریں۔ شام ان قبروں کے کتبوں پر بسیرا کر رہی ہے، جابجا اُگے ہوئے بیری کے درختوں پر بیٹھی چڑیاں ریل کی آواز سے دہشت زدہ ہو کر اڑ رہی ہیں۔

"اماں ریل کی آواز سے ان لوگوں کو کتنا ڈر لگتا ہوگا؟ قبریں تو یوں بھی ڈر لگتا ہے نا؟"

میں اماں سے کہتی ہوں۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جانے کہاں کہاں کی واہیات باتیں دماغ میں بھر گئی ہیں۔" اماں مجھے جھڑک دیتی ہیں! ور میں کھڑکی سے سر باہر نکال کر پیچھے رہ جانے والی قبروں کو دیکھتی ہوں، یہ لوگ قبریں اتنی تنگ کیوں بناتے ہیں کہ آدمی کروٹ بھی نہ لے سکے، میں سوچتی رہتی ہوں اور پھر ریل کی مسلسل حرکت سے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگتی ہے۔

ریل گڑھ مکتیشر کے پل سے گزرنے والی ہے۔ لوگ اٹھنیاں، چونیاں اور دونیاں

ہاتھوں میں دبائے بیٹھے ہیں۔ ابھی ریل شور مچاتی ہوئی گڑھ مکتیشر کے پل پر چڑھے گی تب
بہت سے ہاتھ کھڑکیوں سے باہر نکلیں گے اور اپنی آرزوؤں اور مرادوں کو ان سکوں
سے متعلق کر کے گنگا میّا میں پھینک دیں گے۔ گنگا جی ہماری نذر لو اور ہمیں بامراد کرو۔
گڑھ مکتیشر کا پل ریل کے نیچے سے گزرا جا رہا ہے۔ سکّے اچھل رہے ہیں۔ سکّے لوہے کے
شہتیروں سے ٹکرا کر پل پر گر رہے ہیں۔ سکّے گنگا کے چوڑے سینے میں اُتر رہے ہیں۔ میں
لوگوں کو سکّے پھینکتے دیکھتی ہوں تو بے تاب ہو جاتی ہوں" امّاں میں بھی پیسا پھینکوں گی،
مجھے ایک گڑیا چاہیے۔ امّاں صرف ایک دوّنی" بہت دنوں سے میں ایک سوتی جاگتی
گڑیا کے خواب دیکھ رہی ہوں اور اس لمحے مجھے یقین ہے کہ اگر میں نے گنگا میّا میں ایک
دوّنی بھی پھینک دی تو مجھے سوتی جاگتی گڑیا مل جائے گی۔ میں امّاں کے سامنے مچلنے لگتی ہوں
اور امّاں مجھے جھڑک دیتی ہیں" بے کار باتیں مت کرو، یہ سب ہندوؤں کی خرافات ہیں"
وہ بہت حقارت سے اس ہندو لڑکی کو دیکھتی ہیں جس نے چند لمحے پہلے سکّہ پھینکا ہے
اور بہت خوش نظر آ رہی ہے۔

"امّاں میں مسلمان گڑیا کے لیے پیسا پھینکوں گی" میں انہیں یقین دلاتی ہوں۔ لیکن وہ
میری بات کا یقین نہیں کرتیں، مجھے ایک بار پھر گھڑک دیتی ہیں۔

گڑھ مکتیشر کا پل پیچھے رہ جاتا ہے، گنگا پیچھے رہ جاتی ہے اور میں ریل کی کھڑکی سے سر
ٹکا کر رونے لگتی ہوں۔ آنسو میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہے ہیں اور زنگ آلود کھڑکی
کی درز میں گم ہو رہے ہیں۔

ڈرائنگ روم قہقہوں کی آواز سے گونجنے لگتا ہے، میں پلٹ کر دیکھتی ہوں کاظم
کی ہتھیلی پر ایک سکّہ چمک رہا ہے اس کے چہرے پر شراب اور سرخوشی کی دمک ہے
سب لوگ اس کے قریب کھڑے ہنس رہے ہیں۔

"کاظم نے کون سا معرکہ سر کر لیا ہے؟" میں پوچھتی ہوں۔

"رحمٰن اور کاظم دونوں ہی سلمٰی کو اس کے گھر چھوڑنا چاہتے تھے۔ فیصلے کے لیے ٹاس ہوا تو کاظم جیت گیا۔" مسز مائیکل ہنس کر بتاتی ہیں۔ سلمٰی کے چہرے پر فتح مندی کا غرور ہے۔ اس کا وجود دو مردوں کے درمیان کشمکش کا سبب ہے۔ اس سے خوبصورت بات بھلا اور کیا ہو سکتی ہے۔
وہ ہنستی ہے اور ہاتھ ہلاتی ہوئی کاظم کے ساتھ رخصت ہو جاتی ہے۔

رحمٰن کے چہرے پر شکست کی دُھند ہے لیکن اس دُھند کی خبر اس سکّے کو نہیں جس سے دو انسانوں کی مراد متعلق تھی، جس نے ایک کو بامراد کیا اور دوسرے کو نامراد۔ لیکن بامرادیوں اور نامرادیوں کا قصّہ بہت طویل ہے۔ ہم کسی ایک سکّے کو بھلا کیا دوش دیں۔ کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے کہ سکّہ موجود ہوتا ہے لیکن وہ سکّہ رائج الوقت نہیں ہوتا، بازار میں نہیں چلتا ــــ وہ جو صدیوں سوتے رہے تھے اور اٹھے تھے تو یہ سمجھ کر کہ شاید ایک دن اور ایک رات سوتے رہے ہیں جیب میں کھنکتے ہوئے سکّے لے کر بازار چلے گئے تھے جن پر شہنشاہ دقیانوس کی ضرب تھی لیکن شہنشاہ دقیانوس کا ذکر تو بس کتابوں میں رہ گیا تھا اور اس کی ٹکسال میں ڈھلے ہوئے سکّوں سے اب کچھ بھی نہیں خریدا جا سکتا تھا۔ اس لمحے اُن سونے والوں نے اپنے آپ کو کتنا نادار محسوس کیا ہوگا، تہی دامن، تہی دست اور مفلس۔

لیکن میں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہی ہوں۔ میرے پاس تو وہ سکّہ ہی نہیں جس سے اپنی ایک آرزو متعلق کر سکوں۔

کچھ لوگ چلے گئے ہیں، پھر بھی ڈرائنگ روم میں ابھی خاصے لوگ موجود ہیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس پینٹنگ کے سامنے جا کھڑی ہوتی ہوں جس نے اس کشادہ ڈرائنگ روم کی ایک دیوار کو زیب و زینت بخشی ہے۔ یہ لورینزو لوٹو Lornzo Loto کی مشہور پینٹنگ آندریا اوڈونی Andrea Odini کا پرنٹ ہے ساڑھے چار سو برس پرانی اس پینٹنگ میں ایک عجیب سرّیت ہے۔ پس منظر میں توانا مردوں کے بدن ہیں، سنگِ مرمر میں ڈھلے ہوئے، کسی کا دھڑ نہیں ہے اور کسی کا سر غائب ہے۔ دعوت

نظارہ دیتے ہوئے اپنی طرف بلاتے ہوئے، پیش منظر میں اوڈونی ہے۔ اوڈونی کا ہاتھ جس میں کسی دیوی کی شبیہہ کا طلائی عطر دان ہے آگے بڑھ رہا ہے، یوں جیسے وہ اس طلائی عطر دان کو دینے کا خواہاں ہے اور آنکھوں میں سوال ہے، بولو، بتاؤ، اس عطر دان کے عوض کیا دو گے؟ کتنے لیرا؟ کتنے پیستا؟ کتنے درہم و دینار؟ کتنے روپے؟ اوڈونی کا دوسرا ہاتھ میز پر ٹکا ہوا ہے، میز پر سبز رنگ کا کپڑا بچھا ہے۔ اس کپڑے پر طلائی سکّے بچھے ہیں۔ یہ سکّے جو کینوس کی بُنت میں اور رنگوں کی آمیزش میں مقید ہیں، یہ جب موجود ہوں گے تو جانے کن کن ہاتھوں سے گزرے ہوں گے ان سکّوں سے کیا کیا نہ خریدا گیا ہوگا؟ آرزوئیں، مرادیں، خواہشیں — وہ خوشبو کی شکل میں ہوں، رس بھرے پھلوں کی شکل میں یا حسین اور نوجوان کنواریوں کی شکل میں۔

آرزو — تمنّا — مراد —

یہ کتنے سادہ اور چند حرفی لفظ ہیں۔ لیکن ان سے زیادہ کثیر المعنی لفظ بھلا اور کیا ہوں گے۔ سوتی جاگتی گڑیا، شراب کا جُرعہ، خوشبو، مرد، عورت، ریشم، کتابیں، زیور، رنگین پردے، مجسّمے، موسیقی کے مجموعے، وسیع و عریض اور بلند و بالا عمارتیں، یہ سب اور دوسری ہزاروں، لاکھوں چیزیں جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کی آرزو، تمنّا اور مراد ہیں۔ یہ سب چیزیں جو سکّوں سے خریدی جاتی ہیں۔ سکّے جو کبھی بامراد کرتے ہیں اور کبھی نامراد۔ لیکن کبھی کوئی ایسی آرزو بھی ہوتی ہے جو خریدی نہیں جا سکتی، اُس مراد کے لیے گنگا میا میں سکّہ پھینکنے کی ہمّت بھی نہیں کی جا سکتی۔

میں پلٹ کر کافی ٹیبل تک جاتی ہوں اور اپنا گلاس اٹھا کر کونیک کا ایک گھونٹ بھرتی ہوں اور مجھے امّاں کا خیال آتا ہے۔ اگر اس لمحے امّاں مجھے دیکھ لیں تو شاید امّاں کا کلیجہ پھٹ جائے۔

وہ مر جائیں۔ وہ جنہیں اپنے خون کی نجابت اور شرافت پر اندھا یقین ہے، وہ جنہوں نے جوانی میں بیوگی کا لباس پہنا تو اس پر ذرہ برابر بھی کوئی دھبّا نہ آنے دیا۔ وہ امّاں جنہوں نے گزرِ عمر کے پل سے گزرتے ہوئے مجھے ایک دوتی تک نہ دی تھی۔ آخر سوتی جاگتی گڑیا کی آرزو کیوں

کی جائے؟ دھنک رنگ خواب کیوں دیکھے جائیں؟ وہ امّاں جو مجھے ہر بات پر جھڑک
دیتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ بیٹیوں کا دل مار کر رکھنا چاہیے، ان کی کوئی خواہش پوری
نہیں کرنی چاہیے، جانے کس گھر جائیں، جانے کس کے پلّے باندھیں ـــ امّاں کا فلسفہ
بھی کیسا نرالا تھا لیکن اس فلسفے کے سہارے انہوں نے اپنی زندگی کس قدر سکون
اور دھیرج کے ساتھ گزار دی۔

اماں کے اور میرے درمیان جو پل تھا اس پل کے نیچے سے بہت سا وقت
لمحہ لمحہ کر کے بہہ گیا ہے اور اب میں چاہوں بھی تو اس پل کو عبور کر کے امّاں تک نہیں
پہنچ سکتی۔ مجھے جب اسکالرشپ ملی اور امّاں نے مجھے اپنے سے جدا کیا، اس وقت
انہیں معلوم نہ تھا اور میں بھی یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ دائمی جدائی ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں
کئی مرتبہ ایک دوسرے سے ملے لیکن ہمارے درمیان جدائی بڑھتی رہی، ہم ایک
دوسرے سے دور ہوتے رہے ـــ امّاں اب بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔

ٹورنٹو، مانٹریال، لندن، روم، میڈرڈ ـــ یونی ورسٹیاں، میوزیم، لائبریریاں،
بُل فائٹنگ، مجسمے، رقص، زندگی، رعنائیاں ـــ میں نے دنیا کو اپنی نظر سے دیکھا،
میں نے کتابوں کو اپنے نقطۂ نظر سے پڑھا، میں نے زندگی گزارنے کے لیے اپنے اصول
بنائے اور شاید مجھ میں اماں کی نجابت، اماں کے خون کا بس اتنا ہی اثر رہ گیا تھا کہ میں
نے پھر وہ اصول نہ توڑے۔

کیسی دہشت ہے، کتنی رونق ہے، کیسی تنہائی ہے، کتنا ہجوم ہے، بادیں حلقہ باندھتی ہیں،
ہم تمہیں یوں نہیں جانے دیں گے، ہماری زنجیر زنی دیکھو، ہمارے وجود سے رستا ہوا
لہو دیکھو۔

میری آنکھوں میں سرخ رنگ پھیلنے لگتا ہے، سرخ رنگ، وصال کا رنگ ـــ
سرخ رنگ، ہلاکت کا رنگ۔ میں بے تاب ہو کر اٹھتی ہوں اور کسی جاننے والوں کے

جملوں کو مسکراہٹ سے ٹالتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل آتی ہوں۔ برابر میں مسٹر مارسل کی اسٹڈی ہے۔ دن کی روشنی میں کئی مرتبہ میں اسٹڈی میں آئی ہوں، بیٹھی ہوں، باتیں کی ہیں، کتابیں دیکھی ہیں لیکن رات میں اس کمرے کی عجیب ادا ہے، کتابوں، صوفوں، پردوں، قالین اور Air Freshner کی ملی جلی خوشبو ہے۔

میں اسٹڈی کا دوسرا دروازہ کھولتی ہوں اور ٹیرس پر نکل آتی ہوں۔ ٹیرس پر بڑے بڑے گملوں میں پودوں کی نہ جانے کتنی قسمیں ہیں۔ کیکٹس، کروٹن، ربر پلانٹ ــــ چاندنی پتوں پر بچھی ہے، فرش پر سوتی ہوئی ہے۔ کچھ دور پر بحیرۂ عرب کا جھاگ اڑاتا سر پٹکتا پانی ہے، چاندنی لہروں میں گھل گئی ہے اور سیال ہو کر بہہ رہی ہے۔ سمندر کی خوشبو بڑھی چلی آتی ہے، یوں جیسے امیت بڑھا چلا آتا ہے۔ میں سمندر کی خوشبو سے امیت کے خیال کو کبھی جدا نہ کر سکی شاید اس لیے کہ ہم دونوں پہلی مرتبہ سمندر کے کنارے ملے تھے۔

میں اپنے گروپ کے ساتھ چھٹیاں گزارنے روڈز Rhodes گئی ہوئی تھی، ہم اسی صبح وہاں پہنچے تھے اور ملیس سوفوکلینز پر نبش شیو ٹلیس میں ٹھہرے تھے۔ وہ جولائی کی ایک گرم دوپہر تھی اور میرے تمام ساتھی Rodini Wine Festival میں شرکت کے لیے بے تاب تھے۔ میری طبیعت روڈز پہنچتے ہی خراب ہو گئی تھی اور سفر کی تھکن بھی بہت تھی اس لیے میں نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ سب لوگ چلے گئے۔ وہ پہلے شہر میں گھومنے کا ارادہ رکھتے تھے پھر فیسٹیول میں شریک ہونے کا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں پڑی سوتی رہی۔ جب میری آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ میں نہا کر نکلی تو طبیعت بہت بہتر تھی۔ میں نے اپنا پرس اٹھایا اور تنہا نکل کھڑی ہوئی۔

شام کے دھندلکے میں لپٹے ہوئے Palace of The Knights کی فصیلوں اور برجیوں کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پریوں کی کہانی سے کوئی قلعہ نکل کر سامنے آ گیا ہو۔ میں اپنے خیالوں میں مگن چلتی رہی۔ اجنبی لوگ سائے کی طرح میرے برابر سے گزر رہے

تھے، اجنبی زبانوں میں گفتگو کرتے ہوئے۔ ایک لڑکی پیڑ سے ٹکی کھڑی تھی اور لڑکا اس پر جھکا ہوا تھا۔ ان دونوں کے درمیان ایک گہرا اور گرم بوسہ نمو پذیر تھا۔ ایک میدان میں کچھ ٹورسٹوں نے چھوٹے چھوٹے دو خیمے لگا رکھے تھے، ان کی ویَن بھی برابر میں کھڑی تھی، اب وہ لوگ خیموں سے ذرا فصل پر آگ جلا کر کھانے پکانے میں مصروف تھے۔ حسین لڑکیاں، خوش قامت لڑکے، مچھلی کی طرح تڑپتی پنڈلیاں، سونے کے بالوں کی طرح چمکتے بال، گاتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے، مست الست۔

چلتے چلتے میں سمندر کے کنارے پہنچ گئی، وہاں قدرے سناٹا تھا اور لوگ بھی کم کم تھے، سمندر کی خوشبو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ بحیرۂ قلزم کے نیلگوں پانی پر رات کا اندھیرا اتر آیا تھا اور تاروں کی جھلمل لہروں پر چاندی کی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ اس لمحے میرے کانوں میں ایک آشنا آواز آئی۔ جل تھل ناچے، جنگل ناچے، ناچے من کا مورا، جیون کا سکھ آج پر بھو، موہے جیون کا سکھ آج۔

میں نے اس آواز کو سنا اور ٹھٹھک کر رہ گئی، ہم زبانی کی خوشبو سمندر کی خوشبو میں گھل گئی، میری مٹی کی خوشبو آواز میں ڈھل کر فضا میں پھیل رہی تھی۔ میں آواز کی سمت بڑھی۔

وہ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے دلّی سینٹر میں لائبریرین تھا اور لائبریری سائنس کے ایک مختصر کورس کے سلسلے میں انگلینڈ آیا ہوا تھا اور اب چھٹیاں گزارنے روڈز چلا آیا تھا۔ ہم زبانی اور ہم وطنی کے احساس نے ہم دونوں کو خوشی سے معمور کر دیا۔ ہم دونوں ریت پر بیٹھے اپنے اپنے شہروں کی باتیں کرتے رہے۔ سمندر کی جھاگ اڑاتی موجیں ہم دونوں کو شرابور کرتی گزرتی رہیں، سمندر ہمارے سامنے تھا اور ہم اس سے بے نیاز رہے۔ کتابیں، موسم، گیت، شاعری، ہائیتھنز، ایمفی تھیٹر، سوفوکلیز، ایکرو پولس، پارتھینان، دیویاں، دیوتا، تہوار۔ یونانی تہواروں کے ذکر پر ہم دونوں کو بیک وقت یاد آیا کہ اس وقت Rodini Wine Festival اپنے عروج پر ہوگا۔ ہم جب وہاں پہنچے تو رات نے اور موسم نے

ہر شخص کو اپنے سحر میں اسیر کر رکھا تھا۔ وہ رات جو چھلکتے ہوئے پیمانوں، کوئلے کی آنچ پر سنکتے ہوئے گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو، قہقہوں، تیز موسیقی، بے تکان رقص اور مستی سے عبارت تھی۔

وہ ہماری دوستی کا آغاز تھا، ایسا آغاز جس نے ہم دونوں کو برباد کیا۔ امیت کی شادی ہو چکی تھی اور اس کے دو بچے تھے۔ اور مجھ سے ملاقات کے لمحے تک اسے اپنی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہ محسوس ہوئی تھی۔ لیکن اماں کے بقول میں تو پیدائشی سبز قدم تھی۔ پیدا ہوئی تو باپ کو کھا گئی۔ بڑی ہوئی اور پڑھنے الہ آباد گئی۔ دیالو اور دیوتا ماموں کے ہاں ٹھہری تو وہ دنوں میں چٹ پٹ ہوئے۔ تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میرے سبز قدم امیت کی پُرسکون زندگی کو تہ و بالا نہ کرتے۔

ہم دونوں دنیا کی اونچ نیچ سے آگاہ تھے۔ اس سے پہلے دو تین مرتبہ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں محبت کے مرحلے سے گزر رہی ہوں لیکن ہر مرتبہ، یہ احساس چند مہینوں ہی میں زائل ہو گیا تھا۔ دوسری طرف امیت تھا جس کی زندگی میں بہت سی لڑکیاں آئی تھیں، حسین بدن، سرشار ہوتے اور سرشار کرتے بدن۔ لیکن یہ جو دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی کیفیت تھی، یہ نہ کبھی اس نے محسوس کی تھی، نہ میں نے۔ ہم جب سرشاری کی انتہا پر ہوتے اس لمحے بھی دل مزید قرب کے لیے تڑپتا۔ ہمارے دل جانے کس ملن کے طلب گار تھے۔ ہم نے سنا تھا اور ہم نے دیکھا تھا کہ بدن کی پیاس بجھ جائے تو دل بھر جاتا ہے اور پھر بھلانے کا عمل شروع ہو جاتا ہے لیکن ہم دونوں کے اندر جانے کون سی پیاس بھڑکتی تھی کہ وصال سے بھی نہیں بجھتی تھی۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ عشق کسے کہتے ہیں اور یہ بھی کہ عشق میں ہجر اور وصال کتنے بے معنی لفظ ہیں۔ کیسی دُوری، کیسی حضوری، کیسا وصال اور کیسی مہجوری، ہر ساعت کی اپنی لذت تھی، ہر لمحے کا اپنا کرب تھا۔

امیت کا کورس چند مہینوں میں ختم ہو گیا اور وہ ہندوستان لوٹ گیا، میرا ایم ایس مکمل ہونے میں ابھی ایک برس باقی تھا۔ اس ایک برس میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو جتنے خط لکھے وہ شاید ہی کبھی دو افراد نے ایک دوسرے کو لکھے ہوں۔ میں نے ایم۔ ایس مکمل کیا

تو سید ھی دلی پہنچی۔ امیت دلی میں تھا۔ ہم دونوں کا ملنا ایسا ہی تھا جیسے دو پاگل سمندروں کا ملنا۔ لیکن اپنی تمام دیوانگی کے باوجود مجھے اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ مجھ سے کسی دوسری عورت کو اتنا بڑا نقصان نہیں پہنچنا چاہیے کہ پھر اس کی تلافی ممکن نہ ہو۔ امیت کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی، وہ مجھے ہر لمحہ اپنی تحویل میں رکھنا چاہتا تھا اور یہ اتنی خوبصورت بات تھی کہ اس خوبصورتی سے مستقل جنگ کرتے رہنا اور امیت کی خواہش کو رد کرتے رہنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں بر سر پیکار تھی، اپنی خواہشوں سے، امیت کی آرزوؤں سے۔ میں بہت کمزور تھی، میں خواہشوں کے سمندر میں کائی لگے پتھر پر کھڑی تھی اور جانتی تھی کہ کسی بھی لمحے کوئی تند لہر آئے گی اور مجھے بہا کر اپنے ساتھ لے جائے گی۔

امیت کی بیوی پدمنی بہت اچھی لڑکی تھی، اپنے بچوں، وجے اور پردیپ میں مگن۔ امیت اس کا پتی تھا اور پدمنی کو اس سے اسی نوعیت کی محبت تھی جیسی بیویوں کو شوہروں سے ہوتی ہے۔ وہ اس کے سر پر شجرِ سایہ دار کی طرح قائم تھا۔ اس گھنے سائے میں وجے اور پردیپ تھے، وہ خود تھی۔ کیا میں یہ سایہ ان تینوں سے چھین لوں؟ یہ سوال میرے اعصاب کو شکستہ کیے دے رہا تھا۔ میں پدمنی سے ملی اور دل ہی دل میں اپنے آپ پر نفرین کرتی رہی۔

کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے امیت سے دوری ضروری تھی، میں نے اپنا سامان اٹھایا اور اماں سے ملنے گھر چلی گئی۔ اماں بہت بوڑھی ہو گئی تھیں۔ وہ بہت خوش تھیں کہ ان کی بٹیا ولایت سے پڑھ کر ڈگری لے کر آئی ہے لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ اپنی بیٹی کو ہار چکی ہیں۔ گھر میں میرا جی نہ لگا، گھر کے ماحول اور میری اپنی زندگی میں اب زمین آسمان کا فرق تھا۔ امیت کے خط روزانہ آتے تھے لیکن میں نے ان میں سے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ میں سوچتی رہی۔ میں اماں کو دیکھتی رہی۔ اماں نے اپنی ذات سے کبھی کسی کو دکھ نہیں پہنچایا تھا، میں بھی انہی کی بیٹی تھی۔

پدمنی بھرے پرے پریوار میں پلی بڑھی تھی۔ اس کے ہر طرف شجرِ سایہ دار ہی رہے

تھے، ان کے خنک سائے میں پروان چڑھنے والی لڑکی تو امیت کے بغیر بہت بے آسرا ہو جائے گی، لیکن میرے لیے تو کوئی بھی مرد شجرِ سایہ دار نہیں تھا۔ نہ باپ نہ بھائی، نہ ماموں، نہ چچا۔ مجھے زندگی کی دھوپ میں تنہا چلنے اور جلنے کی عادت تھی۔ اتنی زندگی گزر گئی تھی جو رہ گئی تھی وہ بھی گزر ہی جائے گی، بھلا کیا فرق پڑتا ہے، ہاں واقعی بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔

ایک صبح ناشتے پر میں نے اماں کو بتایا کہ میں پاکستان جا رہی ہوں، ہمیشہ کے لیے۔ اماں کے ہاتھ سے نوالا گر گیا۔ "بٹیا، وہاں تو ہمارا کوئی بھی نہیں"۔ انہوں نے دہل کر کہا۔

"اماں سنا ہے جن کا کوئی نہیں ہوتا ان کا خدا ہوتا ہے"۔ میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا اور اٹھ گئی۔

ہفتے بھر بعد اماں نے مجھے پاکستان کے لیے رخصت کیا تو آنگن لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ آنسو، سسکیاں، ہچکیاں، یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گھر سے جنازہ جا رہا ہو۔ اماں ڈیوڑھی تک آئیں، پھوپھی اماں نے ماش ٹکے سے صدقہ آتارا، اماں نے میرے بازو پر جھلملاتا امام ضامن باندھا۔ میں نے دروازے سے باہر پہلا قدم رکھا تو ممانی جان نے بآوازِ بلند مولا مدد کہا اور دھاڑیں مارنے لگیں۔ میرا رکشا گلی سے نکلا تو رونے کی آواز دور تک مجھے رخصت کرنے آئی۔ ان آوازوں نے مجھے ایک ایسے سفر کے لیے رخصت کیا جس کا کوئی اختتام نہ تھا۔ یہ وہ لوگ بھی جانتے تھے جو مجھے رخصت کر رہے تھے اور یہ میں بھی جانتی تھی، میں کہ رخصت ہو رہی تھی۔ انگنا تو پربت بھیا اور دہلی بھئی بدیس۔

اس آخری سفر میں جب ریل گڑھ مکٹیشر کے پل کے قریب پہنچی تو میں نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا لیکن ریزگاری کے نام پر میرے پاس ایک پیسا بھی نہ تھا۔ مجھے یاد آیا کہ دو اسٹیشن پہلے ساری ریزگاری میں نے ایک نابینا فقیر کی ہتھیلی پر رکھ دی تھی۔ اس لمحے میری انگلیوں نے اماں والے امام ضامن کو چھوا جسے میں نے دوسرے امام ضامنوں کی طرح بازو سے کھول کر

پرس میں رکھ لیا تھا۔ چاندی کا روپیا ریشم کے اندر۔ اندر جگر جگر کر رہا ہوگا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں مجھے خیال آیا کہ اس روپے کو نکال لوں، تب گزرے ہوئے لمحے برق رفتاری سے میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

"اماّں میں بھی پیسا پھینکوں گی، مجھے ایک گڑیا چاہیے، اماّں صرف ایک دوّنی"۔ نو برس کی بچّی نے لہک کر کہا۔

"بے کار باتیں نہ کرو، یہ سب ہندوؤں کی خرافات ہے"۔ ماں نے بچّی کو جھڑکا۔

"اماّں میں مسلمان گڑیا کے لیے پیسا پھینکوں گی"۔ بچی نے بلک کر یقین دلایا۔

لمحے دور ہو گئے، برسوں پیچھے چلے گئے اور میرے ہاتھ کی گرفت سے ریشمی امام ضامن چھوٹ گیا۔ میں نے کھڑکی پر سر رکھا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اماّں نے تو مجھے مسلمان گڑیا کی آرزو کے لیے پیسے نہ دیے تھے پھر امیت کی آرزو کے لیے اماّں کے پیسے؟

میں نے کھڑکی پر سر رکھ دیا گڑھ مکتیشر کا پل آیا اور گزر گیا۔ میرے ہاتھوں نے گنگا میا کو کوئی سکّہ نذر نہ کیا ـــ اور تب میں نے تہیّہ کر لیا کہ اپنے اور امیت کے لیے کوئی دعا نہیں کروں گی، کوئی آرزو نہیں کروں گی۔ وقت جتنے خوبصورت لمحوں کی خیرات مجھے دے، لے لوں گی۔ لیکن خود وقت سے کچھ نہیں مانگوں گی، کبھی نہیں مانگوں گی۔

میرا گلاس خالی ہو گیا ہے، میں ٹیرس کی ریلنگ سے ٹک کر کھڑی ہو جاتی ہوں۔ سمندر کی خوشبو ہر طرف سے اڈ رہی ہے۔ یہ خوشبو مجھے اپنی طرف بلاتی ہے۔ آؤ اور مجھے دیکھو، آؤ اور مجھے برتو، میں ازل ہوں، میں ابد ہوں، میں زندگی ہوں۔ لیکن زندگی کہاں ہے؟ زندگی تو بہت دور رہ گئی ہے اسے ہاتھ بڑھا کر کس طرح چھوا جائے۔

دلّی میں امیت نے مجھے اپنے فیصلے سے پھرانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن سب بیکار تھا، میں جانتی تھی کہ دنیا میں کہیں بھی جاؤں، امیت میرے تعاقب میں چلا آئے گا لیکن پاکستان وہ جگہ تھی جہاں شدید خواہش کے باوجود اس کا پہنچنا ہفت خواں طے کرنے کے

برابر تھا. اس کے گھر کو بربادی سے محفوظ رکھنے کے لیے میرے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا، سو وہ میں نے اختیار کیا۔

امیت سے آخری ملاقات آج بھی اپنی تمام جزئیات کے ساتھ آنکھوں کے سامنے کھنچی ہے جیسے کوئی بہت بڑی پینٹنگ ہو اور اسے میں محدب شیشے سے دیکھ رہی ہوں جیسے کوئی فریم شدہ Tapestry ہو جس کے ریشم کا ہر شیڈ اپنی جگہ واضح ہو۔ کہیں ہلکا سبز، کہیں گہرا کہیں کاہی اور کہیں سیاہ، بھورا، عنابی، گلابی ــ لیکن کیا وہ آخری ملاقات تھی؟

ہم دونوں قطب کے سائے میں ڈھلتی ہوئی زرد دھوپ کی چادر تانے، زرد گھاس پر بیٹھے تھے۔ ہونٹ گنگ، آنکھیں بولتی ہوئی، موتی رولتی ہوئی۔ انگلیاں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی، بدن کا ختم نہ ہونے والا عذاب، اعصاب کا تشنّج، ہر شے جیسے ٹھہری ہوئی، ہوا جیسے تھمی ہوئی۔ لوگ گزر رہے تھے۔ قہقہے، کیمرے، ٹورسٹ اور ان کے گائیڈ۔ اشوک کی لاٹ کی طرف جاتے ہوئے، قطب کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے۔ سب کچھ تھا اور کچھ بھی نہ تھا، امیت نہ تھا، میں نہ تھی، ہر طرف آگ تھی، ماضی تھا جو راکھ کے سوا کچھ نہ تھا، مستقبل تھا جس پر اس راکھ کے بکھرنے کی دھند تھی۔

"اس طرح مت جاؤ۔ اپنے آپ کو اور مجھے یوں نہ برباد کرو۔" امیت نے جانے سویں مرتبہ کہا یا ہزارویں مرتبہ۔ میں گنتی بھول گئی تھی۔ دن مہینے اور سال بھول گئی تھی۔ وہ شخص جس کا نام میرے بدن کی پور پور پہ لکھا تھا جس کی خواہش لہو میں تحلیل ہو کر بدن میں گردش کرتی تھی، وہی شخص شاید آخری مرتبہ میرے سامنے تھا۔ وقت نے جھک کر ہم دونوں سے کہا۔ 'یہ لمحے پھر نہ لوٹیں گے، یہ ساعت پھر نہ آئے گی۔'

آخری ملاقات وہ تھی؟ یا میں اسے آخری ملاقات کہوں جو پالم ایئرپورٹ پر ہوئی۔ ہاتھوں کا لمس گم ہوتا ہوا، چہرے آنسوؤں کی دھند میں لپٹے ہوئے، ہونٹوں کی کپکپاہٹ

رائیگاں جاتی ہوئی، سب کچھ بکھر رہا تھا، وقت کا آبدار خنجر Tapestry کا ایک
ایک ٹانکا ادھیڑ رہا تھا۔ ریشم کٹ کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا زندگی گرم
موم کی طرح پگھل رہی تھی، ڈھیر ہو رہی تھی۔ خاک، باد، آب، آتش ــ بدن جوان چار
چیزوں کا مجموعہ تھا، کیا وہ مجموعہ رہ گیا تھا؟ کیا واقعی وہ باقی تھا؟ میں کہاں رہی تھی؟
وہ کہاں رہا تھا؟ ہر طرف ہجر کی آگ کا سمندر تھا۔

میں لاؤنج سے نکل کر رن وے پر آئی، سامنے ہی انڈین ایئر لائنز کا طیارہ گرج
رہا تھا۔ دلی پر سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی ہوئی طیارے تک
پہنچی، میں نے سیڑھی پر پہلا قدم رکھا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔ طیارے
نے چنگھاڑتے ہوئے دوڑنا شروع کیا ۔ زمین پیروں کے نیچے سے سرکتی جا رہی تھی، تیز
اور تیز ــ پھر ایک جھٹکے سے زمین سے ناتا ٹوٹ گیا۔ وقت کے آبدار خنجر نے Tapestry
کا آخری ٹانکا بھی ادھیڑ دیا۔ نیچے دلی کی روشنیاں جاگ رہی تھیں، اوپر دلِ وحشی کا نصیبہ سو
رہا تھا۔

سر میں اس وقت بھی جیسے کوئی چیز گرج رہی ہے۔ ایک بھاری پن ہے، آنکھوں
میں جلن ہے۔ ہونٹوں پر شراب کے ذائقے کو سگرٹ کی تلخی نے تلخ تر کر دیا ہے۔ حلق میں
کانٹے سے چبھتے ہیں اور پور پور میں پیاس رچی ہے۔ مسٹر مارسل مجھے ڈھونڈتے ہوئے
ٹیرس پر آجاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں کونیک کی بوتل ہے۔ وہ میرا گلاس خالی دیکھتے ہیں تو
اسے بھر دیتے ہیں اور مجھ سے ڈرائنگ روم میں چلنے کو کہتے ہیں۔ میں ان سے معذرت کر
لیتی ہوں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ انہیں معلوم ہے کہ گوشہ گیری میرے مزاج کا بنیادی عنصر
ہے وہ اصرار نہیں کرتے واپس چلے جاتے ہیں۔

میں کونیک کا گھونٹ بھرتی ہوں۔ مجھے بڑی شدت سے روڈز Rhodes کی وہ
رات یاد آرہی ہے جب ہم دونوں نے Rodini Wine Festival میں طرح

طرح کی مقامی شرابیں پی بیٹھیں اور اپنے حواسوں میں نہ رہے تھے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ جتنی بھی پی لوں حواس قائم رہتے ہیں۔

زندگی محض رائیگانی ہو کر رہ گئی ہے۔ امیت کے خط ہر دوسرے تیسرے آتے رہتے ہیں۔ وہاں وہ دھواں دھواں ہے، یہاں میں راکھ راکھ ہوں۔ میں جب مسز مارسل کے ہاں آنے کے لیے نکل رہی تھی تو شام کی ڈاک سے اس کا خط آیا تھا۔ وہ خط میں نے پرس میں رکھ لیا تھا اور راستے میں پڑھا تھا۔ میں اس خط کو نکالتی ہوں اور ایک بار پھر اسے پڑھنے لگتی ہوں۔

"ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے بمبئی جا رہا ہوں، میرا جہاز ابھی زمین سے اٹھ کر Level پر آیا ہے اور تمہاری دلی کے اوپر اڑ رہا ہے، وہ دلی جو تمہیں بہت عزیز ہے، وہ دلی جس میں تمہیں سب سے زیادہ چاہنے والا رہتا ہے۔ وہ دلی جس سے تم نے سب ناتے توڑ لیے۔

"لو اتنی دیر میں ہی جہاز بادلوں سے بہت اوپر آ گیا اور مجھے تمہاری دلی نہیں نظر آ رہی۔ کئی دن سے تمہارا خط نہیں آیا ہے۔ تمہارے خط میری زندگی کا ایک حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کے اور تمہارے خیال کے بغیر میری زندگی ادھوری ہے۔ خیالوں میں تم سے باتیں کرتا ہوں، خوابوں میں تمہیں دیکھتا ہوں اور تم مجھ سے اتنی دور ہو کہ تصور میں بھی دھندلا کر رہ جاتی ہو۔"

"ایئر ہوسٹس نے تازہ اورنج جوس دیا ہے اور میں اسے تنہا پی رہا ہوں۔ اس کی مٹھاس تمہارے ہونٹوں کی مٹھاس سے بہت کم ہے اور اس کی ترشی میں تمہارے نمکین پسینے کی خوشبو ہے۔ میں اس گلاس کو تھوڑی دیر تھامے رہتا ہوں اور یہ سوچ رہا ہوں کہ اسی گلاس سے تم بھی پی رہی ہو۔ اس طرح مجھے تمہارے ہونٹوں کی خوشبو کا احساس ہو رہا ہے۔

"ابھی تھوڑی دیر کے لیے جہاز طوفان میں پھنس گیا تھا اور تمہیں کچھ لکھنا محال ہو گیا تھا

لیکن اب جہاز بادلوں سے اور طوفان سے نکل آیا ہے۔ بمبئی پہنچنے کا اعلان ہو گیا ہے۔ نیچے بارش ہو رہی ہے اور دھند میں لپٹی ہوئی بے شمار اونچی اونچی عمارتیں نظر آ رہی ہیں، اب میں دُور تک پھیلے ہوئے سمندر پر ہوں، جہاز چکر کاٹ رہا ہے، دُور دُور تک پانی ہے اور یہی سمندر تمہارے شہر سے بھی جا کر ملتا ہے، جب تم اپنے شہر کے ساحل پر جانا تو مجھے یاد کرنا اور اور یہ بھی سوچنا کہ اسی پانی کی کوئی لہر بمبئی تک آتی ہوگی۔ اسی بمبئی تک جس کے ساحل پر میں ایک ہفتے تک بلا ناغہ جاؤں گا اور جہاں بیٹھ کر تمہیں یاد کروں گا۔"

میری آنکھیں پُر آب ہو جاتی ہیں۔ سامنے سمندر ہے لہریں آزاد ہیں، کہیں بھی چلی جاتی ہیں، کسی ساحل کو بھی چوم کر آجاتی ہیں لیکن میں بھلا کہاں جا سکتی ہوں۔

اب میں کئی مہینوں سے کراچی میں ہوں۔ یہاں کچھ لوگوں سے شناسائی ہو گئی ہے، کچھ سے انگلینڈ اور کینیڈا کے زمانے کی جان پہچان نکل آئی ہے مسٹر مارسل بھی انہی لوگوں میں ہیں، ان کی ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے۔ وقت گزاری کے لیے میں اس ایجنسی میں کام کر رہی ہوں۔ دونوں میاں بیوی میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ سٹیزن شپ کے لیے سفارشوں کا چکر چل رہا ہے۔ نو آبجکشن سرٹیفکیٹ، پولیس رپورٹ، انڈین نیشنل، پاکستان نیشنل۔

"اچھا تو آپ اب Migrate کر رہی ہیں؟ بہت دیر کر دی آپ نے، ہاں صاحب جن سنگھ والے بھارتی مسلمانوں کو بھلا کب چین سے بیٹھنے دیتے ہیں"۔ ایک مقامی شناسا کہتے ہیں۔

"بھئی ذرا سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا، اب وہ پہلے والی بات نہیں رہی، ملازمتوں کا ملنا محال ہو گیا ہے کوئی بہت بڑی سفارش ہو تو بات الگ ہے۔ ویسے تم تو سنا ہے بڑی کنٹی نینٹلسٹ تھیں"۔ یو۔ پی کے ایک سینیئر بیورو کریٹ کہتے ہیں، جنہوں نے ۴۷ء میں پاکستان کے لیے OPT کیا تھا۔

"عمر بھی تو خاصی ہو گئی ہے بیچاری کی، اب وہاں اچھے رشتے بھلا جڑتے کہاں ہیں۔ شاید اسی چکر میں۔۔۔" ایک شناسا خاتون بہ آوازِ بلند سرگوشی کرتے ہوئے دوسری خاتون سے کہہ رہی ہیں۔

جملے تیرتے ہوئے، کانوں کو برماتے ہوئے، دل کو سوختہ کرتے ہوئے جملے! امیت میری جان، آنے لگے ہیں تیر مری خیمہ گاہ تک۔

میں سمندر پر کروٹیں بدلتی چاندنی کو ایک نظر دیکھتی ہوں اور مڑ کر ڈرائنگ روم میں چلی جاتی ہوں۔ آخری مہمان رخصت ہو رہے ہیں۔ میں بھی مسٹر اور مسز مارسل سے اجازت طلب کرتی ہوں تو وہ دونوں ملازموں کو ہدایتیں دیتے ہوئے میرے ساتھ نیچے آتے ہیں اور پھر حسب وعدہ مجھے گھر چھوڑنے کے لیے اپنی گاڑی نکالتے ہیں۔

ہم کلفٹن برج کے پاس پہنچتے ہیں تو بہت سے لڑکے سائیکلوں، اسکوٹروں پر سوار جتھے بنائے ہوئے سمندر کا رُخ کر رہے ہیں۔ ہم اور آگے بڑھتے ہیں تو ایک ٹکڑی ہمیں انٹرکانٹی نینٹل سے لورز برج کی طرف جاتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ نیٹی جیٹی جا رہے ہیں۔

"یہ اتنے بہت سے لڑکے اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟" مسز مارسل حیرت سے پوچھتی ہیں۔

"آج ان لوگوں کا ایک تہوار ہے اس میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں۔" میں مسز مارسل کو دو جملوں میں ٹال دیتی ہوں۔ میں انہیں اپنا اور اپنے لوگوں کا قصہ کیسے سمجھا سکتی ہوں۔ انہیں کیسے بتاؤں کہ آج صاحب العصر والزماں کی ولادت کی شب ہے۔ یہ لوگ اور ان جیسے بہت سے دوسرے سمندر میں عریضے ڈالنے جا رہے ہیں۔

دعائیں، منتیں، مرادیں، آرزوئیں ــــ دنیا اور دنیا کی خواہشیں جن کا کوئی اختتام

نہیں ہے۔ آج کی رات خواہشوں کی، منتوں کی، مرادوں کی رات ہے۔ آج کی رات عریضے لکھو پھر ان عریضوں کو سمندر میں بہا دو، حسین ابنِ روح کے سپرد کردو۔

میرا جی چاہتا ہے کہ مسٹر مارسل سے کہوں، گاڑی نیٹی جیٹی کی طرف لے چلیں ایک عریضہ میں بھی ڈالنا چاہتی ہوں۔ لیکن کیسا عریضہ؟ کاہے کی آرزو؟ میں نے اپنا معاملہ وقت کے حوالے کیا۔ یا صاحب العصر والزمان، الامان الامان ۔۔۔

بود و نبود کا آشوب

اندھیرا پیڑوں پر بچھ گیا تھا، خوشبو بن کر رات کی رانی میں اُتر گیا تھا، خنکی بن کر ہوا میں گھُل گیا تھا۔

میں دھوئیں سے بھرے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ تھکن میری پنڈلیوں اور تلووں میں رچ گئی تھی۔ اسی لیے میں اپنے شوہر اور اس کے دوستوں سے معذرت کر کے باہر نکلی تھی اور برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں ٹہلنے لگی تھی۔

ڈرائنگ روم کی ساری کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور روشنی کے قتلے برآمدے کے فرش پر بچھے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھ کر مجھے بچپن کا ایک کھیل یاد آیا، جب ہم اپنے گھر کے آنگن میں روشنی کے ایسے ہی بڑے اور چھوٹے قتلوں کو پھلانگتے جاتے اور جب کسی کا پیر غلطی سے روشنی کے کسی قتلے پر پڑ جاتا تو سزا کے طور پر اسے چور بنا دیا جاتا، پھر ہم سب کچھ بھول کر، بھرآمار کر دوڑتے۔ درچور بننے والا لنگڑی ٹانگ سے ہمارے پیچھے لپکتا۔ اس وقت روشنی کے سارے قتلے ہمارے پیروں تلے روندے جاتے اور اندھیرے کے تمام گوشے ہماری چیخوں سے بھر جاتے۔

اُس رات جب میں برآمدے کے ٹھنڈے فرش پہ ننگے پاؤں ٹہل رہی
تھی تو یوں ہوا کہ ڈرائنگ روم کی کھلی کھڑکیوں نے سب کچھ اُگل دیا، سب کچھ
نگل لیا۔

میں اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ میری نظر اپنے شوہر پر پڑی، وہ ہاتھ بڑھا کر
اسٹیریو کا سوئچ آن کر رہا تھا۔ Boney M کی چیختی ہوئی آواز اٹھی۔
Ra Ra Rasputeen میں نے دہشت زدہ ہو کر ان سب کو دیکھا،
اندر چار دوست تھے شراب کے نشے میں ڈوبے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے۔
اور سامنے کتابوں کی الماری پر ایک تصویر تھی۔ تصویر میں سفید پتھروں والی ایک چٹیل
پہاڑی تھی۔ اس پہاڑی کے ایک مختصر حصّے کو تراش کر ہموار دیوار کی شکل دے
دی گئی تھی اور دیوار میں ایک سلاخ دار دروازہ لگا تھا جس میں آہنی قفل تھا۔ اس
دروازے سے پرے ایک غار تھا اور محراب تھی، محراب سے پرے بھی ایک تنگ و
تاریک غار تھا اور اس غار سے پرے ازل تھا، ابد تھا اور لانہایت نیند تھی جو زندوں
اور مُردوں کے درمیان عدل کرتی ہے۔

میں بھی اس تصویر میں تھی، دروازے کی ایک سلاخ کو تھامے ہوئے اور غار
کے اندر جھانکتی ہوئی۔ چہرہ غار کی سمت اور پشت کیمرے کا سامنا کرتی ہوئی اور اسی
تصویر کے برابر کانسی کا ایک مجسّمہ تھا۔ غار کے قیدی کا یہ مجسّمہ میں نے اسی کے شہر
سے خریدا تھا۔

جب میں نے یہ تصویر کھنچوائی تھی اور جس لمحے میں نے یہ مجسّمہ خریدا تھا، اس
لمحے میں نہیں جانتی تھی کہ ایک رات ایسی بھی آئے گی جب میرے ڈرائنگ روم
میں بیٹھا ہوا ایک شخص اس تصویر اور مجسّمے کو دیکھ کر ایک جملہ کہے گا اور پھر اندھیرا
روشنی کے تمام قمقموں کو نگل لے گا۔

میری نگاہیں بھٹکیں اور کتابوں کی الماری کے مقابل رنگین ٹیلی ویژن پر جم گئیں۔ ٹیلی ویژن کیبنٹ پر سیاہ فریم میں جڑا ہوا ایک فوجی اعزاز سجا تھا۔ چند ہفتوں پہلے یہ اعزاز میرے شوہر کو اعلیٰ پیشہ ورانہ خدمات کے صلے میں عطا ہوا تھا۔

کچھ دیر پہلے کا وہ لمحہ میرے اندر ازل کی طرح منجمد تھا جب ڈرائنگ روم کی کھلی ہوئی کھڑکیوں سے میرے شوہر کے عزیز ترین دوست کی آواز آئی تھی اور اس آواز نے پوچھا تھا "یار، یہ سلاخ دار دروازے کی تصویر کیسی ہے؟"

تب میرے شوہر نے بتایا کہ یہ اس بوڑھے فلسفی کا قید خانہ ہے جس نے زہر کے پیالے کے انتظار میں یہاں تیس دن اور تیس راتیں گزاری تھیں۔

یہ سُن کر میرے شوہر کے اسی عزیز ترین دوست نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔ "بھابی نے اس کمرے میں خوب تضاد اکٹھا کیا ہے، ایک طرف صدیوں پہلے زہر پینے والے بوڑھے کے قید خانے کی تصویر اور اس کا مجسمہ ہے اور دوسری طرف تمھیں ملنے والا اعزاز سجا ہے"۔

"ذرا آہستہ بولو۔ تمھاری بھابی نے سن لیا تو قیامت آجائے گی"۔ میرے شوہر کی آواز شاید مریخ سے آرہی تھی۔

"تم تو مجھے یوں خاموش کر رہے ہو جیسے بھابی کو تمھاری ڈیوٹی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم"۔ شراب سے بھیگی ہوئی آواز نے کہا۔

"اُسے واقعی کچھ نہیں معلوم"۔

"لیکن وہ تو اس تقریب میں شریک تھیں جس میں تمھیں یہ اعزاز ملا تھا"۔

"ہاں وہ شریک تو تھی لیکن اُسے نہ اس اعزاز کا پس منظر معلوم ہے اور نہ میری سرکاری مصروفیات کے بارے میں کچھ علم ہے"۔ یہ اس شخص کی آواز تھی جو مجھے جان سے عزیز تھا۔

وہ باتیں کر رہے تھے، میرے شوہر کو داد دے رہے تھے، وہ تنظیم جسے میں بہت عزیز رکھتی تھی اُس کے کچل دیے جانے کا سہرا میرے شوہر کے سر باندھ رہے تھے۔ سیاہ فریم میں جڑا ہوا اعزاز میری نگاہوں کے سامنے تھا اور اس شخص کا چہرہ بھی جسے یہ اعزاز عطا ہوا تھا۔ کیا یہ وہی شخص تھا جس سے میں نے گھنٹوں ادب اور تاریخ کے معاملات پہ باتیں کی تھیں، جو فنون کا دلدادہ تھا، کتابوں کا شیدائی تھا اور فلسفۂ تاریخ جس کا محبوب موضوع تھا۔

کیا یہ واقعی اُسی شخص کی آواز تھی؟

میری ٹانگوں میں دم نہیں رہا تھا، میں وہیں بیٹھ گئی۔ آوازیں مجھ تک آتی رہیں۔ یہ انسانوں کی آوازیں تھیں یا بھیڑیوں کی غراہٹیں؟ وہ ان لوگوں کے نام لے رہے تھے، ان کی باتیں کر رہے تھے جن میں سے کئی کو میں نام بہ نام جانتی تھی۔ ان سے میں نے ادبی نشستوں اور نجی محفلوں میں گھنٹوں باتیں کی تھیں، ان کے ساتھ میں نے کئی پسماندہ بستیوں کا سفر کیا تھا۔ کوردہ علاقے اور اُن میں بسنے والے محروم ترین انسان جن کی زندگی کی پستیوں کا شہر میں رہنے والے تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ پسماندہ بستیوں میں رہنے والوں کے ساتھ اُنہی کی طرح رہتے تھے۔

پھر اُنہی دنوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر چلی گئی۔ جب میرا تعلیمی سفر ختم ہو رہا تھا تو میری ملاقات اس شخص سے ہوئی، جو اب میرا شوہر ہے اور اُن دنوں کسی ٹریننگ کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا۔ بھیا کو جب معلوم ہوا کہ میں اس سے شادی کی خواہشمند ہوں تو انھوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں ایک فوجی کے ساتھ زندگی گزارنے کی استطاعت بھی رکھتی ہوں؟ وہ میری افتادِ طبع سے بخوبی واقف تھے۔ میرے سیاسی نظریات سے آگہی رکھتے تھے اور اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا ہو گئے تھے۔

مجھے ان پہ ہنسی آئی تھی۔ آخر سقراط نے بھی تو یونان کی ریاست کے کسی عام سپاہی

کی طرح حلف اٹھایا تھا اور عہد کیا تھا کہ "میں اپنے ہتھیاروں کی بے حرمتی نہیں کروں گا اور میدانِ جنگ میں اپنے قریب کھڑے ہوئے آدمی کو چھوڑ کر نہیں بھاگوں گا اور دیوتاؤں اور انسانوں کی چیزوں کے لیے جنگ کروں گا"

میں نے کتابوں سے سیکھا تھا کہ پیشے انسانوں کی افتادِ طبع نہیں بدل سکتے، یہ تمام باتیں میں نے بھیّا سے کہی تھیں اور وہ چُپ ہو گئے تھے۔ یوں بھی عشق کے سامنے دلیلیں ہار جاتی ہیں سو وہ بھی ہار گئے۔

شادی کے کچھ دنوں بعد ہم دونوں وطن واپس آ گئے۔ میں پانچ برس ملک سے باہر رہی تھی اور جب واپس آئی تو خواہش کے باوجود پرانے دوستوں سے رشتہ استوار نہ ہو سکا۔ جبر کی فضا میں اضافہ ہوا تھا، لوگ بکھرے گئے تھے اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ کچھ لوگوں نے مجھ پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میں ان کے خیال میں Trojan Horse تھی، وہ مجھے قلبِ لشکر میں کس طرح لے کر جاتے۔

یہ اتنی قیامت کی اذیت تھی جس کا اظہار بھی میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں اپنے اندر سہم کر ٹھٹھر کر رہ گئی۔ وہ بھی حق بجانب تھے اور شاید میں بھی درست تھی کہ عشق کی ماری تھی۔

اس وقت یہ لوگ جن کے نام لے رہے تھے، ان کی گرفتاری کی خبر ہماری واپسی کے چند ہفتوں بعد ہی چھپی تھی، پھر خبر آئی کہ ان کا معاملہ ایک فوجی ٹربیونل کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ میں نے اپنے شوہر سے اس معاملے پر بات کرنی چاہی لیکن وہ ٹال گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ان میں سے کئی میرے ذاتی دوست ہیں۔ وہ تفصیلات بتا کر مجھے اذیت نہیں دینا چاہتا تھا۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک شخص تشدّد کی تاب نہ لا کر ختم ہو گیا۔ اور اس کی لاش لاوارثوں کی طرح ایک چھوٹے سے شہر کے قبرستان میں دفن کر

دی گئی۔ اس کی قبر پر کوئی کتبہ نہ تھا، وہ گمنام سپاہی کی قبر تھی۔ اس کی بیوہ اور اس کے ضعیف ماں باپ کی الحاح وزاری کی ایک کالمی خبریں آئیں اور پھر سب کچھ یوں بھلا دیا گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اُس کی موت کی خبر نے مجھے کئی روز تک رُلایا تھا۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ روشن دماغ اور روشن ضمیر انسان مر بھی سکتا ہے۔ وہ زبان جو دانائی کے موتی رولتے نہ تھکتی تھی، وہ گویائی سے محروم بھی ہو سکتی ہے وہ ہاتھ جنھوں نے ہمیشہ سچ لکھا تھا، وہ پیوندِ زمین بھی ہو سکتے ہیں۔

میں نے بے یقینی کی ریتیلی دیوار کی گگر کو تھام کر یقین کی پتھریلی سرزمین تک پہنچنا چاہا لیکن ریتیلی دیوار کا قامت کم ہو رہا تھا، میری انگلیوں کے درمیان سے ریت پھسل رہی تھی، گر رہی تھی۔

آوازوں کا پگھلتا ہوا، دہکتا ہوا سیسہ، بہتا ہوا میری سماعت تک آ رہا تھا۔ یہ لوگ بار بار اس شخص کا نام لے رہے تھے جو موجود انسانوں میں میرے لیے بہت محترم تھا۔

وہ ہنس رہے تھے، وہ ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ انھوں نے اسے کس کس طرح کی اذیتیں دیں، اس کی انگلیوں سے ناخن کس طرح کھینچے گئے، اُسے کتنے گھنٹے برف کی سل پر لٹایا گیا اور کتنی مرتبہ بجلی کے جھٹکے دیے گئے۔

تب میں نے جانا کہ وہ ہلاک ہونے سے ہفتوں پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اُسے چوپایوں کی طرح چلنے پر مجبور کیا گیا، اُسے برہنہ کر کے غلاظت کے تالاب میں غوطے دیے گئے، پیروں میں وزن باندھ کر اور کلائیوں کو آہنی حلقوں میں جکڑ کر چھت سے لٹکایا گیا۔

اذیت، ہر وہ اذیت جو صرف ایک انسانی ذہن ہی سوچ سکتا ہے، اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو دی گئی۔ صرف اس لیے کہ وہ ان حکمرانوں سے اختلاف رکھتے تھے جنھوں نے انسانوں پر جینا حرام کر رکھا تھا۔ یہ حکمران جن کا خیال تھا کہ وہ زمین پر خدا

کے نائب ہیں اور خدا کے نائبین سے زیادہ بھلا اور کون عدل کر سکتا ہے، سو انھوں نے بھی عدل کیا۔

سزاؤں کا نگرانِ اعلیٰ اندر بیٹھا تھا اور ہنس رہا تھا، جب اس کی نگرانی میں ان سب لوگوں کو سزائیں دی جا رہی تھیں۔ جب ان پر دنیا کی ہر راحت حرام تھی اور جب ان پر عقوبت کا ہر در کھلا تھا، اُنہی دنوں میں نے اس عقوبت کے نگراں کا ہر شام بے تابی سے انتظار کیا تھا اور ہر شب، شب بسری کی تھی۔

کتابیں، کتابچے، رپورٹیں میری نگاہوں میں تھے۔ International Protection of Human Rights ایمنسٹی کی رپورٹ آن ٹارچر۔ اقوامِ متحدہ کا Universal Declaration of Human Rights جس پر میرے شوہر کے سابق و موجود حکمرانوں کے دستخط تھے۔ جس کی پہلی شق یہ تھی کہ تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور وہ یکساں حقوق اور مساوی رتبے کے حقدار ہیں۔ جس کی نویں شق یہ تھی کہ۔۔

لیکن صرف پہلی اور نویں شق کا ہی ذکر کیوں؟ اس دستاویز کی تیس شقیں تھیں اور نہ جانے کتنی ذیلی شقیں۔ تو کیا اس دستاویز پر دستخط کرنے والوں کے اندر کبھی کسی سوال نے سر نہیں اٹھایا تھا؟

ایسے سوال اور ان کے جواب ضمیر کی کھیتی میں اکھوے کی طرح پھوٹتے ہیں اور ضمیر کی کھیتی سفید محل میں رہنے والے ان دیوؤں کے ہاتھ گروی رکھ دی گئی تھی جن کی آنکھیں نیلی تھیں اور جن کے بدن تانبے کے رنگ کے تھے۔

میرے چاروں طرف آوازیں تھیں، آگ تھی اور دھواں تھا، خون کی اور سڑتے ہوئے گوشت کی بساند تھی۔ مجھے اُبکائی آئی اور جو کچھ بھی میرے اندر تھا، باہر آ گیا۔ یہ سڑا ہوا رزق اُس اذیت دہی کے عوض ملنے والے روپوں سے خریدا گیا تھا۔ میں اس سڑے ہوئے رزق کے پاس بیٹھی رہی۔

میں جانے کتنی دیر تک بیٹھی رہی، پھر میں ہمت کر کے اٹھی اور اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ میں نے پانی سے اس سڑے ہوئے رزق کو دھویا۔ لیکن ابھی تو بہت کچھ میرے اندر تھا۔ ابھی تو میرے اندر ایک عزیز از جان رشتے کی مسخ شدہ لاش تھی۔

میں نے اپنے ہونٹوں پر سے لپ اسٹک صاف کی اور آئینے میں مجھ کو اپنا ہاتھ نظر آیا۔ یہ ہاتھ جو مر جانے والے، موجود اور پیدا ہونے والے، دوسرے تمام انسانوں کے ہاتھوں کی طرح کھال، چربی دار خلیوں، نسیجوں، پٹھوں، عضلات، ہڈیوں اور جوڑوں سے بنا تھا۔ یہ ہاتھ جس کا اختتام تمام دوسرے انسانی ہاتھوں کی طرح انگلیوں پر ہوا تھا۔

میں نے آئینے میں اپنی انگلیوں کو دیکھا، سبک اور سجل انگلیاں، مخروطی ناخن اور ان پر دمکتی ہوئی ہلکی گلابی نیل پالش، سورج کی انگلی پر سفید اوپل تھا اور اس کی دودھیا سفیدی میں قوس قزح کے سات رنگ جھلکتے تھے۔

پھر وہ انگلیاں میری نگاہوں میں کھنچ گئیں جنھیں میں نے کئی برس پہلے دیکھا تھا۔ توانا اور مردانہ انگلیاں۔ صاف اور ترشے ہوئے ناخنوں کے نیچے سے خون کی سرخی جھلکتی ہوئی، مشتری اور زحل کی انگلیوں کی پہلی پوروں کے کنارے سگریٹ کے دھویں سے زرد۔ وہ انگلیاں ایک مضمون کے صفحے الٹ رہی تھیں اور وہ ہونٹ ان صفحات پر لکھے ہوئے الفاظ کی ادائیگی میں مصروف تھے۔

وہ آخری موقع تھا جب میں نے ان انگلیوں کو متحرک دیکھا اور ان ہونٹوں کو بولتے ہوئے سنا۔ مجھے آج معلوم ہوا تھا کہ سیاہ بالوں سے ڈھکے ہوئے وہ توانا ہاتھ جب رخصت ہوتے تو محض کھچیاں رہ گئے تھے، ان ستھری اور حساس انگلیوں اور صحت مند گلابی ناخنوں کی جگہ ٹھٹھری ہوئی، کچلی ہوئی بے ناخن انگلیاں تھیں۔

وہ انگلیاں جو شعر لکھتی تھیں، جنھوں نے تاریخ کی جدلیاتی تعبیر پر کتاب لکھی تھی، اپنے عہد کی بدی کے خد و خال اجاگر کیے تھے، وہ انگلیاں خاک کا رزق ہوئیں۔

ڈرائنگ روم سے ایک بار پھر Boney M کی آواز آئی۔ He was Steppe's Wolf میں کسی معمول کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری نگاہوں میں اس بھیڑیے کا توانا بدن کھنچ گیا جسے میں نے لذتوں کا راتب کھلایا تھا۔

اب میں ڈرائنگ روم کی نیم تاریک محراب کے نیچے سایہ سی کھڑی ہوں۔ ان لوگوں نے میری موجودگی کو محسوس نہیں کیا ہے لیکن جب یہ میری موجودگی محسوس کرلیں گے تو یہ جھپٹ کر اپنے بھیڑیا چہروں پر بکروں کے ماسک چڑھالیں گے۔ ان کی غراہٹیں گھٹی گھٹی ممیاتی آوازوں سے بدل جائیں گی۔

کہا جاتا ہے کہ نہ جاننا سب سے بڑی نعمت ہے۔ کچھ نہ جاننے کی کھیتی میں نے کچھ اس طور کاٹی ہے کہ آج میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔

انھوں نے میرے قدموں کی چاپ سن لی ہے اور وہ جلدی جلدی بکروں کے ماسک پہن رہے ہیں۔ میں اپنے شوہر کے چہرے کو دیکھتی ہوں اس شخص کا پرانا ماسک کہاں ہے؟ کیا یہ اسے کہیں رکھ کر بھول گیا ہے؟ کیا یہ وہی شخص ہے، وہی عزیز از جان؟ آواز تکرار کرتی ہے He was Steppe's Wolf میں ایرینا کے وسط میں کھڑی ہوں، تمام روشنیاں مجھ پر مرتکز ہیں اور میرے تمام کردہ و ناکردہ گناہ منہ پھاڑے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔

ابنِ ایوب کا خواب

سب لوگ جا چکے تھے۔ ملک ملک کی زبانیں بولنے والے، نت نئے لباس پہننے والے، تحقیر کرنے والے، رحم کھانے والے، گھگھیانے والے گائیڈ، بھیک مانگنے والے بچے۔ خچروں اور گدھوں کے رینکنے کی آوازیں بھی اب کھو گئی تھیں۔ سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے اور اب وہ اپنے گھر میں تنہا تھا، صحرا کی ریت کے ساتھ، خوف کے ہرم کے ساتھ۔

ابن ایوب نے المونیم کا پیالہ اپنی طرف گھسیٹا تو سکے پیالے کی دیواروں سے سر ٹکرانے لگے۔ اس کی بے ناخن انگلیوں نے ان سکوں کو محسوس کیا اور پھر انھیں گنے بغیر قمیص کی بغلی جیب میں رکھ لیا۔ اندھیرے میں حریصوں کی طرح سکوں کو ٹٹولنا اور انھیں گننا اس کے لیے قابلِ نفرت بات تھی، بالکل اسی طرح وہ صدا لگانے کو بھی طمع کی علامت سمجھتا تھا۔ وقت نے اس کے وجود کو صدائے دریوزہ گری میں بدل دیا تھا، لوگ اس کو دیکھتے تو خود ہی کچھ نہ کچھ اس کے پیالے میں ڈال جاتے۔

وہ ہمت کر کے اپنی جگہ سے اٹھا، گدڑی تہ کر کے کاندھے پہ ڈالی، بقچہ سر پہ رکھا، ایک ہاتھ سے صراحی سنبھالی اور گھسٹتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ یہ چالیس پینتالیس گز جو

اُسے ہر رات اور صبح کو طے کرنے پڑتے تھے، ایک عذاب ناک مسافت تھے۔

بڑے ہرم کی پہلی سیڑھی کے پاس پہنچ کر اس نے صراحی اور بقچہ ریت پر رکھا، گدڑی بچھائی اور پھر بڑے ہرم کی پہلی سیڑھی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی دُکھتی ہوئی پُشت پر اس کے تمام بزرگوں نے اپنے اپنے ہاتھ رکھ دیے ہوں۔ اس کے وجود میں لمحے بھر کے لیے سکون پھیل گیا۔ وہ اب اپنے گھر میں تھا، اجنبی لوگ بھی اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔

چند ثانیوں تک وہ اسی طرح بیٹھا رہا پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کے پُرکھوں کے عقیدے کے مطابق آمون رع کی کشتی اس وقت ظلمات کے سمندر سے گزر رہی تھی۔ خنک رات گیزہ کی ریت پر بچھی ہوئی تھی، خوفو کے ہرم پر سائبان بن کر تنی ہوئی تھی۔ کچھ فصل پر شہر آباد تھا جس کی ان گنت روشنیاں آسمان کے سیاہ سائبان پر روشنی کا سایہ ڈال رہی تھیں۔

اس نے اپنے دونوں پیر پھیلائے اور اس کے منہ سے بے ساختہ ایک کراہ نکل گئی، گھٹنے کے جوڑ کا وہ آبلہ جو اُسے کئی دنوں سے تکلیف دے رہا تھا، اب پھوٹ گیا تھا۔ اُس نے پیپ کو بہتے ہوئے محسوس کیا لیکن اُسے صاف کرنے کی زحمت نہ کی۔ جس طرح اسے سانس لینے کی غیر شعوری عادت تھی، اسی طرح وہ اب اپنے آبلوں سے پیپ کے بہنے کا عادی ہو چکا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا، پھر اس نے بقچے میں ہاتھ ڈال کر مکئی کی روٹی کا سوکھا ہوا ٹکڑا اور پیالہ نکالا۔ پیالے میں اس نے صراحی سے پانی انڈیلا اور روٹی کا ٹکڑا پانی میں بھگو کر کھانے لگا۔ لقمے کے ساتھ ریت کے ذرّے بھی اس کے دانتوں تلے کرکرا رہے تھے لیکن وہ بہت توجہ، بہت انہماک سے اپنے جبڑوں کو چلاتا رہا۔

سینڈوچ، پیسٹریاں، چاکلیٹ ۔ یہ تمام ذائقے ماضی کی دراڑوں میں گم ہو گئے

تھے، وہ انھیں اب بھول چکا تھا لیکن اس وقت وہ تمام ذائقے اس کی طرف لپک رہے تھے۔ وہ انھیں پیچھے کی طرف دھکیلتا رہا، ان ذائقوں کا وہ سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی کمر سے بندھی ہوئی تھیلی میں اتنی رقم ہے کہ وہ اپنے لیے نیا لباس خرید سکتا ہے، تربوز، کھجوریں، شیش کباب، کوفتے اور دوسری نعمتیں کھا سکتا ہے اور یہ بھی کر سکتا ہے کہ نامیہ بیچنے والے خوانچہ فروش کو اشارے سے اپنی طرف بلائے اور اس سے ایک نان اور نامیہ خرید لے۔ لیکن وہ اپنی ان خواہشوں کو مسلسل کچلتا رہتا تھا۔ وہ رقم جو دوسروں کی جیبوں سے نکل کر اس کے پیالے تک آتی تھی، وہ امانت تھی۔ کچھ دنوں پہلے وہ بھیک میں ملنے والے سکے خرچ کر دیتا تھا لیکن اب تو ساری رقم امانت تھی اور امانت کو وہ کس طرح ہاتھ لگاتا؟

پچھلے تین دنوں سے زبیدہ نہیں آئی تھی اور یہ اس کی لائی ہوئی روٹیوں کا آخری ٹکڑا تھا جسے وہ اس وقت چبا رہا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ بقچے میں دو کھجوریں بھی ہیں، یہ کھجوریں بھی زبیدہ ہی اس کے لیے لے کر آئی تھی۔

پہلے وہ روزانہ اس کے لیے کھانا لے کر آتی تھی، کچھ دنوں بعد ہر دوسرے دن آنے لگی اور اب کبھی تین اور کبھی چار دن کا وقفہ ہو جاتا تھا۔ زبیدہ کی آنکھوں کی پتلیوں پر سفید پانی جمتا جا رہا تھا۔ اس کے بیٹوں کو ڈر تھا کہ ان کی ماں کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائے اسی لیے وہ اب اُس کے روزانہ باہر نکلنے پر معترض ہوتے تھے۔

ان دنوں زبیدہ اس سے کچھ زیادہ ہی ناراض رہنے لگی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دن بھر میں جتنی بھی رقم اسے ملتی ہے، اُس سے وہ اپنے لیے کھانے پینے کی چیزیں، دوائیں اور لباس کیوں نہیں خریدتا۔ اس کے آگے پیچھے تو کوئی بھی نہیں تھا پھر رقم جوڑنے کی اور اپنے آپ کو ترسانے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟

وہ سر جھکائے زبیدہ کی ڈانٹ پھٹکار سنتا رہتا اور کبھی یوں بھی ہوتا کہ وہ گھبرا کر بہانہ

بدلتا تو وہ سکے جو اس کی قمیص کی جیب میں قید ہوتے، شور مچانے لگتے۔ وہ شرمندہ ہو جاتا کیونکہ یہ آواز سن کر زبیدہ کے جھریوں سے بھرے ہوئے چہرے پر غصے کی لکیریں اور بھی گہری ہو جاتیں لیکن وہ اسے کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ اس سے کس طرح کہتا کہ یہ سکے امانت ہیں۔

وہ روزانہ ملنے والی بھیک کو بڑی احتیاط سے جمع کر رہا تھا جب اس کے پاس بہت سے پیاسٹر اور ملیم جمع ہو جاتے تو وہ کسی خوانچہ فروش سے ان سکوں کے بدلے گنتی کے نوٹ لے لیتا اور پھر انھیں کمر سے بندھی ہوئی تھیلی میں چھپا لیتا۔

روٹی کا ٹکڑا ختم ہو گیا تو ابن ایوب نے اپنے خارش زدہ اور پیپ میں لتھڑے ہوئے بدن کو گٹھری کی طرح سمیٹا اور خوفو کے ہرم کی پہلی سیڑھی کے سائے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس کی پیوند لگی ہوئی گدڑی پر ریت کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ ریت کے ذرے اس کی داڑھی میں، اس کی پلکوں اور بھووں میں، اس کے بالوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی نوکیلی انگلیاں اسے کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھیں۔ اس وقت بھی ریت کے ذرّوں نے اس کی داڑھی میں سوئیاں چبھوئیں تو وہ بے تاب ہو گیا اور اس کا جی چاہا کہ اپنی داڑھی کو خوب زور زور سے کھجائے۔

اُس نے اپنا داہنا ہاتھ اٹھایا لیکن پھر اُسے یاد آیا کہ اس کی انگلیاں کہاں ہیں، وہ تو بس ٹھڑے ہوئے گوشت کے پیپ بھرے لوتھڑے ہیں۔

اُس نے اپنے بغچے میں کچھ ٹٹولا اور جب ایک نوکیلا اور چکنا پتھر اس کے ہاتھ آ گیا تو اس نوکیلے پتھر سے اپنی داڑھی کھجانی شروع کر دی۔ ایسے کئی چکنے اور نوکیلے پتھر اس نے ایسے ہی وقتوں کے لیے بہت احتیاط سے رکھ چھوڑے تھے۔ اس کے ناخن نہیں رہے تھے لیکن خوفو کے ہرم کے سائے میں ابھی ایسے بہت سے چکنے اور نوکیلے پتھر تھے۔

نوکیلے پتھر نے اسے کچھ تسکین دی، داڑھی کے بالوں میں اُلجھے ہوئے ریت کے

ذرّے کچھ دیر کو نچلے بیٹھ گئے۔ اُس نے ایک گہری سانس لی، اُسے اپنی پُر گوشت بھری بھری اور مستعد انگلیاں یاد آئیں۔ وہ برسوں سے اب اُن دنوں کی یاد کی دُھند میں زندگی کر رہا تھا جب اس کی ریڑھ کی ہڈی میں خم نہیں آیا تھا، اس کا بدن چُست تھا، اس کی انگلیاں مستعد تھیں اور اس کے پیروں میں زمانے بھر کی قوت تھی۔

وہ قبطی النسل تھا، عظیم فراعنہ کی عظیم تر روایات کا سچّا وارث۔ وہ جس گاؤں کا رہنے والا تھا، وہ دریائے نیل کے کنارے آباد تھا۔ اس کے آباؤ اجداد کشتیاں کھیتے تھے، ہل چلاتے تھے لیکن ابنِ ایوب کو نہ ہل چلانا آتا تھا، نہ اسے کشتیوں سے دلچسپی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب قبطی کلیسا کے ایک مشنری گروپ نے اس کے گاؤں کا دورہ کیا اور قبطی عیسائیوں کے بچوں کو پڑھنے کی ترغیب دی تو ابنِ ایوب اس گاؤں کا پہلا لڑکا تھا جو مقدس باپ کے سامنے جا کھڑا ہوا اور ان کے ساتھ قاہرہ چلا گیا۔ اس کی ماں سوتیلی تھی، اسی لیے اُس کے باپ نے بھی اس کا راستہ نہ روکا۔

وہ پانچویں جماعت میں تھا جب اس کے ایک ساتھی نے مقدّس باپ کی جیبی گھڑی چرائی اور پھر خوف سے وہ گھڑی ابنِ ایوّب کے بستے میں چھپا دی۔ جب وہ گھڑی تمام جماعت کے سامنے ابنِ ایوّب کے بستے سے برآمد ہوئی تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے گھڑی واقعی اسی نے چرائی ہو۔ وہ زرد چہرے اور کانپتی ٹانگوں سے کھڑا رہا۔ اُس نے استاد کے کسی سوال کا جواب نہ دیا، کسی الزام کی تردید نہ کی اور جب چھٹی کا گھنٹا بجا تو ہوسٹل کی بیرک نما عمارت کا رُخ کرنے کی بجائے اس نے بستہ کلیسا کے احاطے کی دیوار سے لگا کر رکھا اور خود باہر نکل گیا۔

اس دن کے بعد وہ کبھی بھولے سے بھی اُس کلیسا کی طرف سے ہو کر نہ گزرا۔ اُس رات اُس نے ایک پارک کے بہتے ہوئے نل سے پانی پی کر اپنا پیٹ بھرا اور دوسرے دن جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ چلتا رہا اور جہاں وہ ٹھہرا وہاں گرجے کے سے

ہوتے تھے اور بے شمار مزدور کام کر رہے تھے۔

یہ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا کیمپ تھا جو فرانس اور امریکہ سے آئے تھے اور زمین کھود کر قدیم مصر کو مٹی کی قید سے آزاد کر رہے تھے۔

اُسی دن اسے وہاں کام مل گیا۔ یہ کھدائی کے دوران نکلنے والی مٹی کو ٹوکری میں بھر کر دوسری جگہ ڈالنے کا کام تھا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ برس تھی۔

وہ مہینوں یہی کام کرتا رہا، پھر ایک دن ہمّت کر کے اس نے اپنے باپ کے نام ایک خط بھیجا اور ہفتوں جواب کا انتظار کرتا رہا لیکن انتظار بے سود تھا۔ اتنے دنوں مٹی ڈھوتے رہنے کی مشقّت نے اسے زندگی کے بہت سے نکتے تعلیم کر دیے تھے۔

اگلی مرتبہ اس نے خط کی بجائے تھوڑی سی رقم باپ کے نام منی آرڈر کر دی۔ دو ہفتے بعد اسے گھر سے خط موصول ہوا جس میں سگے باپ اور سوتیلی ماں نے اسے بہت سی دعائیں بھیجی تھیں اور یہ بھی پوچھا تھا کہ جہاں وہ کام کرتا ہے وہاں سے اُسے کیا ملتا ہے اور یہ کہ بدعادتوں میں پڑ کر اسے رقم نہیں اڑانی چاہیے۔

اُنہی دنوں امریکہ سے ایک نیا آفندی آیا ہوا تھا۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ ابنِ ایّوب قبطی کلیسا میں پانچ جماعتیں پڑھ چکا ہے، عربی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی لکھنا بھی جانتا ہے تو وہ سائٹ سپرنٹنڈنٹ پر ناراض ہوا اور اُس نے ابنِ ایّوب سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ رہے، وہ اسے کھدائی کے دوران برآمد ہونے والے مٹی کے ٹھیکروں کی صفائی کا کام سکھائے گا اور اگر اس نے ذہانت سے کام لیا تو پھر اُسے Numbering اور Catalouging سکھائی جائے گی۔

مصر کے بازار میں یعقوب کا بیٹا یوسف سوت کے چند گولوں کے عوض بکا تھا اور اُس دن آفندی ڈیمک نے ابنِ ایّوب کو بن داموں خرید لیا۔

آفندی ڈیمک نے کام کے آغاز سے پہلے اُسے اپنے خیمے میں بُلایا اور اس سے

باتیں کرتا رہا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی عربی بولتا رہا اور ابن ایوب نے اٹکتی ہوئی انگریزی سے کام چلایا۔

آفندی ڈیمک نے اسے بتایا کہ فراعنہ قبطی النسل تھے اور چونکہ وہ بھی قبطی الاصل ہے اس لیے وہ اور اُس جیسے دوسرے اپنے اجداد کے صحیح وارث ہیں اور وارثوں پر واجب ہے کہ جب وہ اپنے اجداد کی عظمت کے ثبوت اکٹھے کریں تو اس میں بہت احتیاط، اخلاص اور تحمل کا ثبوت دیں۔

دوسرے دن جب اس نے آفندی ڈیمک کے خیمے کے ایک گوشے میں رنگین اور منقش ٹھیکروں کے ڈھیر دیکھے اور اس نے جب ان ٹھیکروں کو ہاتھ لگایا تو اس کے بدن کا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ اس دن اسے اپنا باپ، اپنی ماں، اپنے بھائی سب بہت حقیر لگے۔ وہ عام سے لوگ تھے اور ایک وہ تھا کہ ہزاروں برس پہلے گزرنے والے شہنشاہوں کے مقبروں سے نکلنے والے سازوسامان کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ اُس دن اُس نے ان ٹکڑوں پر سے چونے کی تہ، گرد اور مٹی صاف کرتے ہوئے اپنی روح کی تمام قوت اور مستعدی اپنے ہاتھوں میں منتقل کر دی تھی۔

جلد ہی اُسے یومیہ اجرت کی بجائے تنخواہ دی جانے لگی اور اس نے آفندی ڈیمک کے ذاتی خدمت گار کے فرائض بھی سنبھال لیے اور جس طرح اس کے آقا کا وفادار کتا نپولین اچھے راتب سے نوازا جاتا تھا اسی طرح ابن ایوب کو بھی لنچ اور ڈنر کا پس خوردہ ملنے لگا۔ تب اس کی زبان نے اُن ذائقوں کو جانا جن سے اس کا سارا خاندان اور اُس کے گاؤں کے تمام لوگ نا آشنا تھے۔ وہ ان سب سے کس قدر زیادہ اہم تھا، کتنا خوش نصیب تھا۔ وہ آفندی کو اس کے دُھلے ہوئے کپڑے نکال کر دیتا، اس کے جوتوں پر پالش کرتا اور اس کے بچے ہوئے سینڈوچ اور سوپ سے اپنا پیٹ بھرتا۔ وہ اپنے خدا سے کس قدر قریب تھا

اس کی اطاعت گزاری، جاں نثاری اور زیادہ سے زیادہ کام سیکھنے کی لگن نے اسے بہت جلد مٹی کی زبان سمجھنا سکھا دیا۔ زمین اور اس کے مختلف طبقات، مختلف پرتیں، کاربن ۱۲' اور کاربن ۱۴ کے نمونے جو کھدائی میں درآمد ہونے والی شے کے زمانے اور اس کی قدامت کا تعین کرتے تھے، موٹر ڈرل اور Magnetometer کا استعمال، کھدائی سے پہلے کھونٹیوں کی تنصیب۔

اب وہ خاصی صاف انگریزی بولنے لگا تھا' اس نے قاہرہ اور دوسرے کئی شہروں کے میوزیم دیکھ ڈالے تھے اور آفندی کے ساتھ کرناک، لکسر اور تھیبز تک ہو آیا تھا۔

ابن ایوب کی ٹانگ میں خارش اور تپکن کی ایک لہر سی اٹھی اور وہ بے تاب ہو گیا۔ اُس نے بڑی مشکل سے کھجانے کی خواہش پر قابو پایا اور ایک بار پھر آفندی ڈیک کے بارے میں سوچنے لگا۔

اُسے احساس ہوا کہ واقعات کی ترتیب اسے صحیح یاد نہیں رہی ہے۔ آفندی نے جب اُسے ترقی دی تھی، اس کے چند ہی مہینوں بعد باپ اور سوتیلی ماں کے اصرار نے اور اس کے بدن میں ہنگامہ برپا کرتی ہوئی خواہشوں کے سیلاب نے اُسے شادی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُس کی بیوی اُس کے سوتیلے ماموں کی بیٹی اور ایک صابر و شاکر دیہاتی لڑکی تھی۔ وہ شادی کے نو برس بعد تک زندہ رہی اور اس کا بیشتر وقت تنہا ہی گزرا' ابن ایوب اسے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا اور وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنے پر مجبور تھی کیونکہ شادی کے چار ہی سال کے اندر ابن ایوب کا باپ اور اس کی ماں دونوں چل بسے تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے اپنے پوتے کو دیکھ لیا تھا۔ اُس کا نام انھوں نے یوسف رکھا تھا، یوسف کے بعد ابن ایوب کے خاندان میں قطعاً اضافہ نہ ہوا۔

ابن ایوب کا بیٹا اس کی شدید خواہش کے برخلاف گاؤں میں پلتا بڑھتا رہا۔ اُسے اپنے باپ کے کام سے کوئی دلچسپی نہ تھی' وہ اپنے نانا کے ساتھ کشتی کی سیر کو جاتا اور اپنے

نانا اور ماموؤں کی طرح کشتی رانی کا اور مچھلیاں پکڑنے کا دلدادہ تھا۔

امبابہ، قاہرہ کا ایک چھوٹا سا محلہ تھا، کم حیثیت اور کم سواد لوگوں کا محلہ اور یہیں اس کی ملاقات زبیدہ سے ہوئی۔ زبیدہ کے لیے اس کی خواہش میں کوئی کھوٹ، کوئی وقتی ہیجان شامل نہ تھا۔ وہ اس کا احترام کرتا تھا اور اس کے عشق میں گرفتار تھا۔ زبیدہ بھی اس پر مرمٹی تھی، وہ گھنٹوں اسے فراعنہ کے خزانوں کے قصے اور ان رنگین دیواروں کی کہانیاں سناتا جو آج سے کئی ہزار برس پہلے بنائی گئی تھیں۔

لیکن مشکل یہ تھی کہ زبیدہ مسلمان تھی اور وہ عیسائی۔ وہ شادی شدہ تھا اور اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا تھا۔ غرض یہ کہ وہ زبیدہ کو دیکھتا اور آہیں بھرتا۔ خواہشیں بے لگام ہونے لگتیں تو بازار چلا جاتا اور کسی بھی کسی کے ساتھ ایک رات گزار آتا۔

جس نرمی اور محبت سے وہ فراعنہ کے مقبروں سے نکلنے والے مٹی کے ٹھیکروں کو چھوتا تھا، اس نرمی سے اُس نے کبھی ان عورتوں کے بدن نہیں چھوئے تھے جنھیں وہ ایک رات کے لیے خریدتا رہا تھا۔ وہ اسی کی طرح گوشت پوست سے بنی تھیں، وہ نہ ہزاروں برس قدیم تھیں اور نہ کسی فرعون کے مقبرے سے برآمد ہوئی تھیں۔ ان کے بدن کے نشیب و فراز کسی شاہی کمہار کے چاک پر بھلا کب ڈھلے تھے کہ وہ انھیں احتیاط سے برتتا۔ اور پھر یہ بھی تو تھا کہ وہ انھیں خریدنے کے پیسے ادا کرتا تھا جبکہ فراعنہ کے مقبروں سے نکلنے والے مٹی کے ٹھیکروں کو چھونے اور صاف کرنے کے عوض اسے روپے ملتے تھے۔ مٹی کے یہ ٹھیکرے اس کے آقا تھے۔ فراعنہ ہزاروں برس پہلے ختم ہو چکے تھے لیکن ان کے ساتھ دفن ہونے والے برتنوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اب بھی ان گنت لوگوں کو دو وقت کی روٹی عطا کرتے تھے۔ فراعنہ نہیں رہے تھے اور پھر بھی وہ رازق تھے، ان داتا تھے۔

وہ زبیدہ کے لیے تڑپتا رہا اور اسی اثنا میں زبیدہ کی شادی ہو گئی۔ وہ اپنے عم زاد سے بیاہ دی گئی جو تربوز اور کھجوریں بیچتا، اس کی ہر بات پر شک کرتا اور ہر تیسرے چوتھے دن طلاق

کی دھمکی دیتا تھا۔

زبیدہ کی شادی کے ڈھائی برس بعد اس کی بیوی ختم ہو گئی تب اس نے بہت چاہا کہ وہ زبیدہ کو کسی طور اپنے شوہر سے طلاق لینے پر آمادہ کر سکے۔ اُس نے کہا کہ وہ شادی کے لیے مسلمان ہو جائے گا، اسے قاہرہ کے کسی اچھے محلّے میں گھر لے کر دے گا لیکن زبیدہ اب ایک بیٹے کی ماں تھی اور دوبارہ امید سے تھی۔ وہ جانتی تھی کہ خلع کی صورت میں اس کا بیٹا اس سے چھن جائے گا اور آخر کار نوزائیدہ بھی اس سے الگ کر دیا جائے گا۔ زار زار روتے ہوئے اس نے ابن ایوب کو سمجھایا کہ وہ اسے بھول جائے اور اپنے ہی مذہب کی کسی لڑکی سے شادی کر لے۔

ابن ایوب نے یہ مشورہ سنا اور اسے ذہن کی گہرائیوں میں دفن کر دیا۔ فرق ہوا تو بس اتنا کہ وہ ہر دوسرے تیسرے کسبیوں کے پاس جانے لگا۔ دل کے معاملے الگ ہیں لیکن بدن دل کے معاملے بھلا کب سمجھتا ہے۔

اسی زمانے میں اس کے جنگھاسوں پر گلٹیاں نمودار ہوئیں اور پھر وہ زخموں میں تبدیل ہو گئیں۔ ان گلٹیوں اور زخموں نے اس کے جسم میں آگ لگا دی اور درد نے اس کے وجود میں بسیرا کر لیا لیکن پھر بھی وہ لگن سے کام کرتا رہا۔

ابن ایوب کو وہ دن آج بھی پوری تفصیل کے ساتھ یاد تھا جب آفندی ڈیمک نے خوفو کی شاہی کشتی دریافت کی تھی، جب ایک چٹان میں سوراخ کر کے رسّی سے ٹارچ باندھی گئی تھی اور اس ٹارچ کی روشنی میں پانچ ہزار برس پرانی اُس تدفینی کشتی کو سب نے باری باری دیکھا تھا جسے فرعون خوفو نے اس لیے تیار کرایا تھا کہ موت کے بعد وہ اس میں بیٹھ کر مقدس دریا کو عبور کر سکے اور ابدی زندگی کا سفر اختیار کر سکے۔

اس کشتی کو گہری خندق سے نکالنے کا کام بہت تھکا دینے والا اور اعصاب شکن تھا، اور اس تمام ہنگامے کے دوران وہ آفندی ڈیمک اور پروفیسر ابو بکر کا دستِ راست رہا تھا۔

اُن لمحوں کو یاد کر کے ابنِ ایوب کے بدن میں سرخوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور اس کا جی کچھ کھانے کو چاہا، یوں بھی اُس نے مکئی کی روٹی کا جو ٹکڑا تھوڑی دیر پہلے پانی میں بھگو کر کھایا تھا، وہ اس کی بھوک مٹانے کے لیے ناکافی تھا۔ وہ سوچتا رہا پھر اُسے وہ کھجوریں یاد آئیں جو زبیدہ چند دن پہلے لائی تھی اور جن میں سے دو کھجوریں اس نے بچالی تھیں۔ تکیے میں سے ٹٹول کر اس نے وہ دونوں کھجوریں نکالیں، ان میں سے ایک اپنی مٹھی میں دبالی اور دوسری کو منہ میں رکھ لیا۔ اس کی اینٹھی ہوئی اور ذائقوں کو ترسی ہوئی زبان پر شیرینی کی دھنک سی نکل آئی۔ وہ دیر تک اُس ایک کھجور کو جبڑوں کے تہ خانے میں اُلٹتا پلٹتا رہا، چوستا، چباتا رہا۔ شیریں لعاب اس کے حلق سے نیچے اُترا تو اسے محسوس ہوا کہ زندگی اب بھی بہت حسین ہے، بہت بامعنی ہے۔

اس نے کھجور کی گٹھلی کو ایک طرف تھوک دیا، اس کا جی چاہا کہ مٹھی میں دبی ہوئی دوسری کھجور بھی کھالے لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا اور کھجور کا وہ دانہ واپس تکیے میں رکھ دیا۔ کھجور کا دانہ واپس رکھنے کے بعد اسے ہنسی آگئی، ایک یہ زمانہ ہے اور ایک وہ زمانہ تھا جب وہ آفندیوں جیسا کھاتا تھا اور کبھی کبھی ان کی طرح پہنتا تھا لیکن اب اُسے اِس کی قطعاً پروا نہیں تھی کہ زمانہ اسے کیا کھلاتا ہے، پہناتا ہے اور کس طرح رکھتا ہے۔

اسے زندگی کا سب سے بڑا دھچکا اُس وقت پہنچا جب آفندی ڈیمک واپس چلا گیا اور اس کی جگہ آنے والے آفندی نے اسے وہ منصب عطا نہ کیا جس پر فائز رہنے کا وہ کئی برس سے عادی تھا۔

ادھر اس کی گٹھیاں اور زخم بڑھتے اور پھیلتے ہی چلے جارہے تھے۔ وہ کیمپ کے ڈاکٹر سے اکثر ہی دوائیں لیتا رہتا تھا لیکن فائدے کی کوئی صورت نہ تھی۔ نئے آفندی نے اُس کی حالت دیکھی تو اُسے قاہرہ کے ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس اپنا خط دے کر بھیجا۔ ڈاکٹر نے اسے اچھی طرح دیکھا بھالا، خون اور پیشاب کا معائنہ ہوا۔

دوسرے دن جب وہ دوبارہ ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے نئے آفندی کے نام ایک خط دیا۔ ابن ایوب اپنے مسیحا کا خط لے کر کیمپ پہنچا، نئے آفندی نے ڈاکٹر کا خط پڑھا اور اُسے کھڑے کھڑے ملازمت سے برخاست کر دیا۔

وہ صرف اکزیما ہی کا بیمار نہیں تھا، اُسے آتشک بھی ہو گئی تھی۔ جو وقت اس نے کسبیوں کے پاس گزارا تھا، وہی وقت اُس کے لہو میں سڑ گیا تھا۔

اُس نے اپنی ساری جمع پونجی علاج پر خرچ کر دی لیکن آرام اس سے بہت دور جا چکا تھا۔ وہ ماہرینِ آثار کے کیمپوں میں مارا مارا پھرتا، اپنی کارگزاری اور اپنی صلاحیتیں بتاتا۔ آفندی ڈیمک کا دیا ہوا اعلیٰ کارکردگی کا سرٹیفکیٹ دکھاتا لیکن کوئی نہ اس کی صلاحیتوں سے غرض رکھنا چاہتا تھا، نہ سند دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ روحانی اور جسمانی دونوں جذاموں کی سزا بھگت رہا تھا۔

خندقیں، زمین کی گہرائیوں میں اُتری ہوئی سرنگیں، فراعنہ کے چھوٹے اور بڑے ہرم، مٹی کے برتنوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے۔ یہ سب کچھ اس کی زندگی تھے۔ وہ قبطی الاصل تھا اور اس نے اپنی زندگی اپنے عظیم شہنشاہوں کے آثار کی دیکھ ریکھ کے لیے دان کر دی تھی۔ وہ ان چیزوں کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا لیکن اب مردہ شہنشاہوں اور زندہ عالموں کو اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

جب اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ رہی تو وہ اپنے گھر چلا گیا۔ گھر اس کے سوتیلے بھائی، اس کی بیوی اور بچوں کا تھا اور اس گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

بھائی سے مایوس ہو کر اس نے خسر کے گھر کا رُخ کیا جہاں اس کا بیٹا تھا، اس کا اپنا خون۔ بیٹا مچھلیاں پکڑتا تھا اور اپنی شادی کے لیے پیسے جوڑ رہا تھا۔ یوسف نے جب باپ کا یہ حال دیکھا تو کہا کہ وہ دو راتیں بیل کے چھپر تلے گزار دے، وہ مچھلیاں پکڑنے جا رہا ہے۔ دو روز بعد واپس آئے گا تو اس کے لیے دریا کے کنارے ایک جھونپڑی ڈال دے گا اور روزانہ اُسے

کھانا پہنچا دیا کرے گا۔

بیٹے کا یہ ہمدردانہ رویّہ ابنِ ایّوب کے لیے نعمتِ عظیم تھا۔ وہ بیل کے پیشاب کی کھراند اور گوبر کی بُو سے بسی ہوئی فضا میں دو دن تک اپنے زخموں سے مکھیاں اڑاتا رہا اور اُن روٹیوں پر گزارا کرتا رہا جو بیٹا اُسے دے گیا تھا۔

تیسرے دن یوسف کا نانا اپنی داڑھی نوچتا ہوا اور سر پر خاک ڈالتا ہوا بیل کے چھپر تک آیا اور چیخ چیخ کر ابنِ ایّوب کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ ابنِ ایّوب نے اپنے زخموں پر سے مکھیوں کو اڑاتے ہوئے اس کی چیخ پکار کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ نیل کی لہریں یوسف کی کشتی کو نگل گئی ہیں۔

ابنِ ایّوب سر جھکائے بیٹھا رہا اور اپنے خسر کی فریاد سنتا رہا۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔ اُسے وہ دن یاد آیا جب اُس نے قبطی الاصل شہنشاہ خوفو کی تدفینی کشتی کو زمین کی گہرائیوں سے نکالنے والے رسّوں کی چرخی کو چلایا تھا اور پانچ ہزار برس پرانی کشتی کو وہ اور اس کے ساتھی اوپر لے آئے تھے۔ اور اب جب کہ اس کا خون، اس کا اکلوتا بیٹا لکڑی کے معمولی تختوں سے بنی ہوئی کشتی میں بیٹھ کر نیل کی گہرائیوں میں اتر گیا تھا تو وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی لاش ڈھونڈنے کے لیے دریا میں بھی نہیں اتر سکتا تھا۔

ایک وہ کشتی تھی اور یہ بھی ایک کشتی ہی تھی اور یوسف بھی خوفو کی طرح قبطی النسل ہی تھا۔ اس رات ابنِ ایّوب کو ملکہ نی کے مقبرے کی رنگین دیواری تصویر یاد آئی۔ اس تصویر میں ایک دریائی گھوڑی دردِ زہ کے عذاب سے گزر کر اپنے بچّے کو جنم دے رہی ہے۔ بچّے کا آدھا دھڑ باہر آچکا ہے اور عین اسی جگہ ذرا نیچائی کی طرف ایک مگرمچھ منہ کھولے للچائی ہوئی نظروں سے بچّے کو دیکھ رہا ہے کہ کب وہ ماں کے پیٹ سے باہر آئے اور کب وہ اُسے نگل لے۔

یوسف زندگی کے بطن سے باہر آیا ہی تھا کہ موت کے گھڑیال نے اسے نگل لیا۔

ابنِ ایّوب اپنے بیٹے کی موت کے تیسرے دن پو پھٹے بیل کے چھپر سے باہر آیا اور قاہرہ

کی طرف چل پڑا۔

کئی دن بعد جب وہ قاہرہ کے قریب پہنچا تو نیم مردہ تھا۔ اس کی جیب میں قسم کھانے کو ایک ملیم کا سکہ بھی نہ تھا اور اس کی انتڑیوں نے دو دن سے اناج کے ایک بھی دانے کا بوجھ محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنا خارش زدہ بدن اور بھوک سے اینٹھتی ہوئی انتڑیاں لے کر قبطی کلیسا چلا جائے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے بدن کا ضرور علاج کریں گے۔ اس کے معدے کو اناج سے بھر دیں گے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ پھر اس کی روح کا بھی علاج کرنا چاہیں گے۔ اُس کی روح جو اُن کے نزدیک بیمار تھی، تب ہی تو وہ کسبیوں کے گھر جھانکتا پھرا تھا۔

اس نے شہنشاہوں کے مقبرے، اُن کی ممیاں، ان کا ساز و سامان، ان کے زر و جواہر سب کچھ دیکھے تھے۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ حیاتِ جاودانی کے لیے فراعنہ اور ان کے امراء نے جو عظیم الشان مقبرے تعمیر کرائے تھے اور جو ساز و سامان جمع کیا تھا وہ سب لٹیروں نے لوٹ لیا تھا اور سفید پٹیوں میں لپٹی ہوئی ممیاں اُن لٹیروں کا کچھ نہ بگاڑ سکی تھیں، دوائیں، تعویذ اور سراب ان لٹیروں کا بال بیکا نہ کر سکے تھے۔ روح، حیات بعد موت اور روزِ آخرت پر سے اس کا اعتبار اٹھ چکا تھا۔ وہ اپنے عظیم جد خوفو کی طرح پروہتوں اور راہبوں سے نفرت کرتا تھا۔

برسوں پرانا اپنا وہ بستہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا جسے وہ کلیسا کی دیوار کے سائے میں رکھ کر چلا آیا تھا اور پلٹ کر کبھی نہیں گیا تھا۔ ایک ناکردہ گناہ کی سزا اس نے یہ بھگتی تھی اور اب تو وہ کردہ گناہوں کی سزا پاتا تھا۔

وہ سوچتا رہا اور لڑکھڑاتا ہوا چلتا رہا۔ اس کے پیروں میں آبلے تھے اور روح کانٹوں کے بستر پر تھی۔ چلتے چلتے اس نے اپنے آپ کو خوفو کے ہرم کے سائے میں پایا۔ اس کی داستان جہاں سے شروع ہوئی تھی، ایک بار پھر وہیں آکھڑی ہوئی تھی۔

دیس دیس کے لوگوں کا ہجوم تھا، وہ ہجوم سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا، لوگ اس کے قریب سے گزرتے رہے پھر کسی نے گزرتے ہوئے اس کے سامنے چند پیاسٹر پھینک دیے۔ گزرنے

والا گزر گیا۔ وہ ان سِکّوں کو چند ثانیوں تک دیکھتا رہا پھر اس نے اپنی ٹھٹھری ہوئی اور اینٹھی ہوئی انگلیوں سے وہ سکّے اٹھائے اور اس طرف لپکا جہاں ایک خوانچہ فروش روٹی اور تامیہ بیچ رہا تھا۔

یہ پہلی خیرات تھی جو ابن ایّوب نے قبول کی اور جس کے عوض اسے ایک روٹی اور تامیہ میسر آیا۔

یومیہ اجرت کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا تھا۔

دن، ہفتے، مہینے، سال، لمحہ، ساعت۔ یہ سب اس کے لیے بے معنی لفظ تھے۔ تمام دن یکساں تکلیف تھے، تمام راتیں مسلسل درد تھیں۔ تمام مہینے عذاب کی گردان تھے اور تمام سال اذیتوں کا تسلسل تھے۔ پھر وہ دنوں کے نام اور مہینوں کی تاریخیں کیوں اور کس لیے یاد رکھتا۔ اب اسے وقت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

جانے کتنے دن اسی طرح گزر گئے۔ خوفو کا ہرم، آس پاس پھیلے ہوئے دوسرے کھنڈر اور مقبرے اس کا گھر تھے۔ وہ رات کو خوفو کے ہرم کی پہلی سیڑھی سے لگ کر سو جاتا اور دن بھر ہرم کے سامنے اپنی گدڑی پر بیٹھا رہتا۔ اسے صدا لگانے یا گھگھیانے سے نفرت تھی۔ یوں بھی زندگی اب اس قابل نہیں رہی تھی کہ اس کے لیے وہ مزید ذلّت اور مزید رسوائی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتا۔ وہ گھومتے ہوئے سیاحوں، بھیک مانگتے ہوئے فقیروں، انگریزی اور فرانسیسی بولتے ہوئے گائڈوں اور کھانے پینے کا سامان بیچتے ہوئے خوانچہ فروشوں کو دیکھتا اور خاموشی سے ریت پر لکیریں کھینچتا رہتا۔ گزرتے ہوئے لوگ اسے دیکھتے تو خود ہی چند سکّے اس کے سامنے پھینک دیتے۔

پھر اس نے ایک دن زبیدہ کو دیکھا۔ وہ سر پر گٹھری رکھے ہوئے سامنے سے گزر رہی تھی۔ اور وہ پہلی ساعت تھی جب اس نے ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑا۔ اس کے منہ سے زبیدہ کا نام بے ساختہ ایک چیخ کی صورت میں نکلا۔

زبیدہ نے اپنا نام سنا تو ٹھٹھک گئی۔ ایک فقیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ الجھی ہوئی داڑھی، بڑھے ہوئے بال، بدن پر مکھیاں بھنکتی ہوئی۔ اُسے گمان ہوا کہ شاید اس کے کانوں نے غلط سُنا ہے لیکن جب فقیر نے اس کا نام دوبارہ لیا تو وہ جھجکتے ہوئے قریب آئی۔

زبیدہ نے ابن ایوب کو پہچانا تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ جس شخص نے آج سے برسوں پہلے اس سے شادی کرنے کی خاطر اپنا مذہب بدلنے کی ہامی بھری تھی، جو اس کو ریشمیں کپڑوں اور چمکیلے پتھروں والے زیوروں کے تحفے دیتا تھا، جو اُسے کئی مرتبہ اچھے ہوٹلوں اور سینما گھروں میں لے گیا تھا، جس کا بٹوا گنّی اور پیاسٹر کے نوٹوں سے بھرا رہتا تھا۔ وہی خوش پوشاک اور کھاتا پیتا آدمی کاسۂ گدائی لیے بیٹھا ہے۔ اپنے بدن سے مکھیاں اڑاتا ہے پر وہ نہیں اُڑتیں۔

ابن ایوب نے زبیدہ سے کچھ نہ چھپایا۔ چھپانے سے فائدہ بھی کیا تھا۔ وہ سر جھکائے سب کچھ سنتی رہی، پھر اُس نے گٹھڑی اٹھا کر سر پہ رکھی اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

وہ پہلی رات تھی جب ابن ایوب نے لمحوں، ساعتوں اور گھنٹوں کا حساب کیا۔

دوسرے دن وہ آئی تو اپنے شوہر کا ایک جوڑا اور نائی ساتھ لائی۔ نائی نے ابن ایوب کا حال دیکھا تو اس کے بال تراشنے اور داڑھی بنانے سے انکار کر دیا۔ وہ جھنجلاتا اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا تو زبیدہ، ابن ایوب کا ہاتھ پکڑ کر ایک قریبی جوہڑ تک لے گئی اور جب وہ اس جوہڑ سے زندگی کے تمام غم اور ساری محرومیوں کو دھو کر نکلا تو زبیدہ نے اُسے اپنے شوہر کی اُترن پہنا دی۔ ابن ایوب نے اپنے آپ کو جتنا امیر اُس دن پایا، اس کا وہ حساب بھی نہ کر سکا۔

زبیدہ نے اپنے ہاتھ کی پکائی ہوئی روٹی اور کباب اس کے سامنے رکھ دیے۔ وہ کھاتا رہا اور زبیدہ اسے بتاتی رہی کہ امابہ کا علاقہ تو انھوں نے برسوں پہلے چھوڑ دیا تھا اور اب وہ ایک قریبی بستی میں رہتے ہیں۔ اس کے شوہر نے تربوز بیچنے کا کام ترک کر دیا تھا اور اب وہ برتنوں کی ایک دکان پر کام کرتا تھا۔ اس کے تینوں بیٹے بھی اب اس قابل ہو گئے تھے کہ خوانچہ

لگا کر اور آفندیوں کی گاڑیاں دھو کر روزانہ کچھ نہ کچھ گھر لے آتے تھے۔

اس دن کے بعد زبیدہ نے یہ روز کا معمول بنا لیا کہ وہ دوپہر سے پہلے اس کے لیے کھانے کی پوٹلی لے کر آتی، کچھ دیر اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی اور چلی جاتی۔

کئی برس تک زبیدہ نے اپنے معمول میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ اگر کسی دن اس کا شوہر طبیعت کی خرابی یا چھٹی کے سبب گھر میں ہوتا، اس دن ابنِ ایوب کو انتظار لاحاصل کے عذاب سے گزرنا پڑتا۔

پھر اچانک زبیدہ تیزی سے بوڑھی ہونے لگی، اس کی آنکھوں میں موتیا کا پانی اترنے لگا، اس کے چہرے پر جھریوں کا جال تیزی سے پھیلنے لگا۔ ایک دن اُس نے کہا کہ وہ اب روزانہ اتنا نہیں چل سکتی ہر دوسرے دن آیا کرے گی، ابنِ ایوب کے لیے دن اب بارہ گھنٹوں کی بجائے ۲۴ گھنٹوں کا اور رات بھی بارہ کی بجائے ۲۴ گھنٹوں کی ہونے لگی۔

اس کے بعد زبیدہ کئی دن تک نہ آئی، وہ دن اور راتیں ابنِ ایوب نے جہنم کے ساتویں طبقے میں بسر کیں۔ چند دنوں بعد اُس نے دیکھا کہ ایک گھبرایا ہوا لڑکا ایک ایک فقیر کو غور سے دیکھتا اور کچھ پوچھتا ہوا گھوم رہا ہے، پھر وہ لڑکا اس کے پاس آکر رک گیا۔ یہ زبیدہ کا لڑکا تھا اور اس کے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کی ماں عدت میں ہے۔

وہ لڑکا ہر تیسرے چوتھے اس کے لیے کھانا لے کر آتا اور پوٹلی جلدی سے اس کے حوالے کر کے چلا جاتا۔ اس کی سمجھ میں یقیناً یہ بات نہیں آئی ہو گی کہ اس کی ماں آخر اُس خاص فقیر کے لیے ہی خیرات کیوں بھجواتی ہے۔

زبیدہ کی عدت کی مدت ابنِ ایوب نے کانٹوں پر بسر کی، وہ اس کی ویران اور پُرآزار زندگی میں مسرت کا واحد لمحہ تھی۔ وہ آئی تو اسے دیکھ کر ابن ایوب پہلے تو بہت خوش ہوا، پھر وہ رو دیا۔ وہ اب واقعی بوڑھی ہو گئی تھی۔

اب جب کہ اس کا شوہر نہیں رہا تھا، زبیدہ نے چاہا کہ وہ اس کے ہاں چل کر رہے۔ وہ اس کے لیے الگ کوٹھری کا انتظام کر دے گی لیکن ابنِ ایوب نے سختی سے انکار کر دیا۔ وہ جوان بیٹوں کی بوڑھی ماں کے احترام میں کسی کمی کے آنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے زندگی میں صرف ایک عورت کا احترام کیا تھا اور وہ زبیدہ تھی۔ پھر اب وہ اسے کس طرح بے وقار کر سکتا تھا۔ پاس پڑوس والے کیا کہیں گے، جوان بیٹے نہ جانے کیا سوچیں گے۔ یوں بھی اب اسے زمانے سے کوئی شکایت نہ تھی۔ وقت نے اس کے ہاتھ میں بھیک کا ٹھیکرا تھما دیا تھا لیکن وقت نہ اس سے ماضی کی یادیں چھین سکا تھا اور نہ زبیدہ کے دل سے اس کی محبت کھرچ سکا تھا۔ اور یہی وہ مقام تھا جہاں وقت اس سے ہار گیا تھا۔

ایک دن جب زبیدہ اس کے لیے کھانا لے کر آئی تو باتوں ہی باتوں میں زبیدہ کی آنکھ کے آپریشن کا ذکر نکل آیا۔ زبیدہ نے اسے بتایا کہ اگر خیراتی ہسپتال میں آپریشن کرایا جائے تب بھی خاصی رقم دواؤں اور کھانے پینے پر اُٹھ جاتی ہے۔

اُس دن کے بعد ابنِ ایوب نے اپنی ذات پر اپنی یومیہ اجرت کا ایک سکہ بھی خرچ نہ کیا۔

ابنِ ایوب آہستہ سے ہنسا، اُس نے اپنی کمر سے بندھی ہوئی تھیلی ٹٹولی، اس میں نوٹ ہی نوٹ تھے اور یہ نوٹ اس کی مہینوں کی بچت کا نتیجہ تھے۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ کل یا پرسوں جب زبیدہ آئے گی تو وہ ساری رقم اس کے حوالے کر دے گا۔ یہ اتنی رقم ضرور تھی کہ اس کی آنکھوں کا آپریشن کسی خیراتی ہسپتال کی بجائے کسی اچھے ہسپتال میں ہو سکے، دوائیں بھی خریدی جا سکیں اور کھانے پینے کی چیزیں بھی۔

یہ رقم زبیدہ کی امانت تھی، وہ اس امانت کو اُسے ہی لوٹا دے گا۔ خوشی اس کے بدن میں دائرے بنانے لگی، لہریں لینے لگی۔ پھر اس کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی، کاش وہ اسے اپنی بیوی بنا سکتا۔ اس نے زبیدہ کو اپنی خواہشوں سے محفوظ رکھنے کے لیے کسبیوں کا گھر دیکھا تھا۔ اگر زبیدہ اس کی ہوتی تو پھر وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا۔

وہ ہڑبڑا کر ایک بار پھر اُٹھ بیٹھا۔ اس کی نگاہیں اندھیرے میں کیسے کیسے خاکے بنا رہی تھیں پھر ان میں رنگ بھر رہی تھیں۔ زبیدہ اس کی دلہن بنی ہوئی تھی۔ وہ اسے ملکہ نیفرتیتی کے زیور پہنا رہا تھا، اس کی انگلیوں کو ملکہ تی کی انگوٹھیوں سے سجا رہا تھا۔ خوفو کی شاہی کشتی میں بٹھا کر وہ اسے نیل کی سیر کرانے نکلا تھا۔ وہ اسے کرناک، تھیبز اور لکسر کے کھنڈر، مقبرے اور مندر دکھا رہا تھا۔

وہ اس کے ساتھ تھی، اس میں تھی، وہ اس کی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، اس کے ہونٹوں سے چکھ رہی تھی، اس کے سینے میں بھر گئی تھی۔

ابن ایوب کے سینے میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ زبیدہ آج اس کی تھی، صرف اس کی۔ آج کی رات جشن کی رات تھی۔

اس کا دایاں ہاتھ بے اختیار بقچے میں رینگ گیا، کھجور کا آخری دانہ بقچے میں تھا، اس کے ہاتھ نے زبیدہ کی عطا کو ٹٹول کر مٹھی میں دبا لیا۔ بھولے بسرے ذائقے اس کی اینٹھی ہوئی زبان اور ترسے ہوئے حلق میں بکھرنے لگے۔ شیریں ذائقے اس کی زبان کو چھوتے ہوئے حلق سے نیچے اتر رہے تھے، لمس کی صد رنگ لذتیں اس کی پور پور میں سانس لے رہی تھیں۔

ہیرے کی طرح چمکتی ہوئی دو آنکھوں نے پلکیں جھپکا کر ادا سے اُسے دیکھا پھر وہ دو آنکھیں فضا میں تیرتی ہوئی اس تک آئیں اور اس کی کمر سے بندھی ہوئی تھیلی میں چھپ گئیں، یہ آنکھیں اب اس کی تھیں، صرف اس کی۔

یہ جشن کا لمحہ تھا، اس کا دایاں ہاتھ لبوں تک آیا، آخری کھجور کو جبڑوں اور دانتوں کے حوالے کرنے کے لیے اور اسی لمحے ابن ایوب کے ہاتھ نے اور اس کے بدن نے جھٹکا کھایا، وہ لذت کی شدت سے دُہرا ہو گیا اور پھر اس کا زخمی وجود زمین پر بچھ گیا۔

ابن ایوب کا پہلا اور آخری خواب مکمل ہو گیا تھا۔

رنگ، تمام خوں شدہ

دیواروں پر کنول روشن تھے، امام باڑے کے وسط میں لٹکتے ہوئے جھاڑ کا ہر فانوس روشن تھا۔ چاروں کونوں میں اگر دان جل رہے تھے اور خوشبو ماحول اور منظر کو اپنے پَروں میں سمیٹے ہوئے تھی۔

گیلریاں عورتوں اور بچوں سے پٹی ہوئی تھیں، نیچے مردوں کا ہجوم تھا۔ سیکڑوں لوگوں کی سانسوں کے ساتھ مل جل کر اگر کا دھواں اوپر کو چڑھ رہا تھا۔

عذرا کو گھُمیری سی آئی۔

سوزخواں تخت سے اُتر چکے تھے۔ اُن کے لحن کی گونج ابھی لہو میں گردش کر رہی تھی۔ علی کرار صاحب زیب منبر ہو چکے تھے۔ اُن کی پاٹ دار آواز امام باڑے کے طاقچوں، دروں اور دریچوں میں گریہ کر رہی تھی۔

گھر گھرتے ہیں بستی بن یہ بدعت ہے، یہ بیداد
ویراں ہیں جو سو گھر تو کہیں ایک ہے آباد
پھرتے ہیں مکانوں کے مکیں مضطر و ناشاد
حاکم ہے وہ مغرور کہ سنتا نہیں فریاد

لفظ ——— ان کے معانی، ان کی جہتیں اور ان کی نزاکتیں آواز کے وسیلے سے سننے والوں تک پہنچ رہی تھیں اور حسبِ ذوق، حسبِ استطاعت استعارے اور اشارے اپنا اثر دکھا رہے تھے۔

مغرور حاکموں اور مظلوم محکوموں کی یہ کہانی کتنی قدیم تھی۔ ہر استبدادی شہر کوفہ تھا۔ ہر مغرور حاکم ابنِ زیاد تھا۔ عہد بہ عہد کہانی کا لوکیل، اس کے کرداروں کے نام، ان کی قومیتیں اور ان کے عقیدے بدل جاتے تھے۔

علی کرار صاحب کی آواز کڑکی۔

یہ معرکہ دیکھے گا وہ، زندہ جو رہے گا
خوں تا بہ کمر دارِ امارہ میں بہے گا

عذرا کو ایک بار پھر زور کی گھمیری سی آئی اور اُس نے بے تاب ہو کر اپنی پیشانی گیلری کے آہنی جنگلے سے ٹکا دی۔ ٹھنڈک اُس کے اندر اترنے لگی، خوف کی اور بے یقینی کی ٹھنڈک۔ دارِ امارہ میں تو کسی کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی تھی، وہاں راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

صبح کورٹ میں اُس نے اپنے دوستوں کو گاڑی سے اُترتے دیکھا تھا۔ یہ لوگ جس گاڑی سے اتارے گئے تھے اس کے عقبی حصے میں اوپر کی طرف ایسا ہی آہنی جنگلہ لگا ہوا تھا اور جب گاڑی کورٹ کے احاطے میں رُکی تھی تو اُس جنگلے سے اُسے اپنے دوستوں کے چہروں کی کترنیں سی نظر آئی تھیں۔ سفید ڈھیلے، سیاہ دیدے، مٹیالی پیشانیاں۔

نیچے بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی سر اٹھا کر دیکھے تو شاید اُسے بھی ہمارے چہروں کی کترنیں نظر آئیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی عذرا کی نگاہوں میں وہ رلیاں گھوم گئیں جو سیکڑوں اور ہزاروں میں بکتی تھیں اور رنگین کپڑوں کی کترنوں سے بنائی جاتی تھیں۔

'لیکن یہ لوگ انسانوں کی کترنوں سے کیا بناتے ہیں؟ دارِ امارہ کے قالین شاید انہی کترنوں سے بنتے ہوں، حکمرانوں کی قباؤں میں بھی شاید یہی کترنیں استعمال ہوتی ہوں'؟
علی کرار صاحب کی آواز کی گریہ ناکی اُسے پھر زماں سے مکاں میں کھینچ لائی۔

اب آ نہیں سکتے کہ ہمیں گھیرے ہیں جلاد
بابا کی وصیت نہ بھلانا یہ رہے یاد
مشکل ہے جو کچھ، سہل ہوئی جاتی ہے بیٹا
بچوں سے خبردار کہ فوج آتی ہے بیٹا

در و دیوار سسکیوں اور آہوں سے بھر گئے۔ علی کرار صاحب دلوں کو شق کر کے منبر سے اُتر آئے۔ عذرا نے اپنی آنکھیں خشک کیں اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات خاصی گزر گئی تھی اور اب گھر پہنچنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ صبح اُسے بہت سویرے اٹھنا تھا اور ساتھ بجے اس پنج ستارہ ہوٹل میں پہنچ جانا تھا جہاں سے ایک قافلہ روانہ ہونے والا تھا۔ قیمتی رلّیاں، خوبصورت اجرکیں، رنگین کرسیاں اور نیلے رنگ کے منقش برتن اس قافلے کے منتظر تھے۔

قافلے کو اپنے شہر سے چلے ہوئے ساتواں اور آخری دن تھا۔ آج شب شب رخصت تھی۔ آج دن ہی دن میں انھیں سب کچھ دیکھ لینا تھا، ہر چیز برت لینی تھی۔ حیدر آباد، ہالہ اور بھٹ شاہ سے گزر کر قافلہ اب امر کوٹ میں تھا اور قلعے کے اندر اُترا ہوا تھا۔

تاریخ جب کسی عجائب گھر میں کتابوں، ہتھیاروں، فرامین اور تصویروں کی صورت میں نظر آئے تو لوگوں کا رویہ اس کے بارے میں کچھ قبرستانوں جیسا ہوتا ہے۔ آہستہ چلو۔ آہستہ بولو۔ ہنسی نہ آئے۔ بس گزرے ہوئے بادشاہوں کی بادشاہی کے نمونے دیکھو، ان کا اپنے حکمرانوں سے موازنہ کرو اور گھر کی راہ لو۔

اِس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورت تھی۔ ہال میں سب دبے قدموں چل رہے تھے اور سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ ایک دیوار پر توڑے دار بندوقیں، ڈھال، خود، طمنچے اور تبر آویزاں تھے اور دوسری دیوار پر بہت سی مغل تصویریں بھی ہوئی تھیں۔ ______ ایک میں سیف الملوک کا منظر تھا کہ شہزادہ ناچتی ہوئی پریوں کے جھرمٹ میں ہے۔ دوسری میں شہزادہ نہا رہا ہے۔ نہلانے والی کنیز بھی پانی میں اُتری ہوئی تھی اور بے لباس تھی۔ تیسری تصویر میں جواں سال اکبر اپنے درباریوں کے درمیان تھا۔ سر پر چھتر کا سایہ تھا، درباریوں کے سر جُھکے ہوئے تھے اور شہنشاہ کے سامنے زمین پر ایک کیڑا رینگ رہا تھا۔ شاید یہ کیڑا اس عہد کے عوام کا Symbol تھا۔ اُن ہی جتنا بے بضاعت اور بس اُن ہی جتنا قابلِ ذکر۔

آقا اور رعیت کے رشتے سے نجات نہ عجائب گھر میں تھی، نہ مغلیہ عہد کی تصویروں میں۔ عذرا نے مُڑ کر اُس شوکیس کو دیکھا جو اکبرِ اعظم کی تصویر کے نیچے رکھا تھا اور دو دھیا روشنی سے بھرا ہوا تھا۔ شوکیس میں رکھی ہوئی کتاب کھلی ہوئی تھی اور اس کے نیچے "آئینِ اکبری" کی اور "ابوالفضل علامی" کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔

عذرا نے جُھک کر کھلے ہوئے صفحے کی عبارت پڑھنی شروع کی۔

"بادشاہی اُس ربِّ یکتا و بے مثل کا ایک پرتو، آفتابِ عالمتاب کی ایک کرن، کمالات کے صحیفوں کی فہرست اور لیاقتوں کا مجموعہ ہے۔ اُسے موجودہ زبان میں "فرایزدی" اور زبانِ قدیم میں "کیان خورہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بغیر کسی درمیانی وسیلے کے خدا کی طرف سے مقدس جسم میں پہنچائی جاتی ہے اور اس کے دیدار سے تمام لوگ اپنی جبینِ ستائش غلامی کی چوکھٹ پر رکھ دیتے ہیں۔"

اُسے بے اختیار ہنسی آگئی۔ شاہوں کے، حکمرانوں کے آئین ابتدا سے اب تک ایک ہی تھے۔ عہد بہ عہد اُن کے القاب بدل جاتے تھے۔ ان کا طریقِ حکمرانی بدل جاتا تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ ظل اللہ تھے، مامور من اللہ تھے۔ آج بھی حکمرانی، حکمرانِ وقت کے مقدس جسم میں بغیر کسی درمیانی وسیلے کے پہنچتی تھی۔

اُس کا دم گھٹنے لگا، عجائب گھر کی دیواروں پر ہتھیار تھے اور عجائب گھر کی الماریوں میں وہ کتابیں تھیں جو ان ہتھیاروں کو ظالموں کے حق میں استعمال کرنے کی دلیلیں لاتی تھیں "تحفۂ شیر شاہی"۔ "آئینِ اکبری"۔ "انشائے ابوالفضل"۔ شاہ کے حق میں ہر دلیل تھی۔ شاہ کا ہر دعویٰ درست تھا۔

وہ گھبرا کر باہر نکل آئی۔ کھُلی فضا میں، تازہ ہوا میں لیکن فضا اور ہوا میں بارود کی بُو تھی۔ اُس نے فصیل سے دیکھا۔ قلعے کے دروازے سے آرمرڈ کاروں کا ایک کانوائے نکل رہا تھا۔ چند میل دُور تھر کے ریگستان میں فوجی مشقیں ہو رہی تھیں۔ قلعے میں فوجی کیمپ قائم تھا، دو جرنیل ان مشقوں کو دیکھنے کے لیے قلعے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

میزبان محکمے کے پی آر او بہت خوش تھے۔ حیدر آباد کا سیمینار بہت کامیاب رہا تھا اور دوسری بستیوں کا سفر بھی۔ فصیل پر لڑکیاں ان کے گرد اکٹھی تھیں اور انھیں طرح طرح کے مشورے دیے جا رہے تھے۔ کسی کو فوجی مشقیں دیکھنے کا اشتیاق تھا اور کوئی انھیں اس پر راضی کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ چند گھنٹوں بعد شب چاردھم شروع ہونے والی ہے تو کیوں نہ رات ریگستان میں گزاری جائے اور تھر کی ریت پر سوئی ہوئی چاندنی دیکھی جائے۔

پی آر او صاحب نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر بتایا کہ تیس چالیس لوگوں کے لیے ریگستان میں رات گزارنے کا فوری طور پر انتظام ان کے لیے ممکن نہیں۔ اس

خواہش کا اظہار اگر اُن سے ایک دن پہلے کر دیا جاتا تو وہ ضرور کچھ کرتے۔ اور تب اچانک لاہور سے آنے والی ڈیلیگیٹ تہمینہ نے یاد دلایا کہ اکبر اعظم کی جائے پیدائش قلعے سے کچھ فاصلے پر ہے تو کیوں نہ وہاں کا رُخ کیا جائے۔

ہاں بی بی — یہ ضرور ممکن ہے لیکن وہ جگہ ریگستان میں ہے، وہاں ہماری گاڑیاں نہیں پہنچ سکتیں، ریت میں پھنس جائیں گی۔ آپ سب یہیں فصیل پر ٹھہریں، میں کرنل صاحب سے بات کرتا ہوں۔ اگر انھوں نے اپنے ٹرک ہمیں دے دیے تو بات بن جائے گی۔' پی آر او صاحب نے نیچے کا رُخ کیا، ان کے نائب چنّہ صاحب بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ وقت گذاری کے لیے لڑکیوں نے دو ٹکڑیوں میں بٹ کر گانا شروع کر دیا۔

عذرا اور اُسی جیسی چند دوسری بے سُری لڑکیاں قلعے کی فصیل سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں اور مختلف زبانوں اور مختلف علاقوں کے گیت سننے لگیں۔ کسی بھی ٹکڑی کو گانے مکمل یاد نہ تھے اس لیے ایک گیت ابھی پورا نہ ہوتا تھا کہ دوسرا شروع ہو جاتا تھا۔

"تم نے میوزیم میں لگے ہوئے فرامین دیکھے؟" لاہور کی تہمینہ نے سگرٹ سلگاتے ہوئے عذرا سے پوچھا۔ ان سات دنوں میں عذرا نے اُسے کھُل کر بات کرتے یا ہنستے نہیں دیکھا تھا۔

"ہاں دیکھے بھی اور پڑھے بھی"۔

"تمہیں اُن میں اور اب کے فرامین میں کچھ فرق نظر آیا؟" تہمینہ نے دھواں چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے تو بہت فرق نظر آیا۔ پہلے وہ عقوبت کے احکامات فارسی میں صادر کیا کرتے تھے اب یہی احکام انگریزی، اردو اور پنجابی میں دیے جاتے ہیں۔ تمھارے خیال میں کیا یہ بڑا فرق نہیں ہے؟"۔

تہمینہ خاموشی سے ماچس کی جلی ہوئی تیلی سے فصیل کی ایک درز کو کُرید نے لگی۔

"فصیلوں میں جلی ہوئی تیلیوں سے نقب نہیں لگتی۔" عذرا نے اُسے یاد دلایا

یہ بات مجھ سے زیادہ کون جانے گا، میرا دوست شاہی قلعے میں ہے" تہمینہ نے آہستہ سے کہا اور اس کا فقرہ عذرا کو دہلا گیا۔ اس نے بے تاب ہو کر تہمینہ کا ہاتھ تھام لیا جو نازک تھا، سفید تھا اور سرد تھا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں، مجھے اس کا قطعاً علم نہ تھا" عذرا کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اور کیا کچھ کہے۔

"کوئی بات نہیں" تہمینہ نے مسکرانے کی کوشش کی اور اس طرف متوجہ ہو گئی جدھر لڑکیوں کی ایک ٹکڑی فرش پر بیٹھی تھی اور تالیوں کی سنگت میں زور زور سے گا رہی تھی۔

"تری محفل میں قسمت آزما کے ہم بھی دیکھیں گے"

تھوڑی دیر بعد اُن کے قافلے نے جو دو فوجی ٹرکوں اور ایک جیپ پر مشتمل تھا، صحرائے تھر میں اُس علاقے کا رُخ کیا جہاں اکبرِ اعظم کی پیدائش ہوئی تھی اور جس سے ذرا آگے فوجی مشقیں ہو رہی تھیں۔

خوف آسمان پر تنا ہوا تھا، سروں پر Aleoutte ہیلی کاپٹر اُڑ رہے تھے اور دور سے ٹھہر ٹھہر کر گولیوں کی آواز آ رہی تھی۔ مشقیں یقیناً بڑے پیمانے کی تھیں، تب ہی Blank کارتوس استعمال کیے جا رہے تھے۔

جیپ ناہموار راستے پر آگے بڑھ رہی تھی۔ عذرا نے کچے گھروں اور جھونپڑوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے بعض کی چھتوں پر لمبے بانسوں سے بندھے ہوئے سیاہ پھریرے ہواؤں میں اُڑ رہے تھے۔ یہ سیاہ علم اس بات کی علامت تھے کہ ابن سعد ابھی قتل نہیں ہوا ہے، عابد بیمار ابھی مسکرائے نہیں ہیں، سوگ ابھی بڑھا نہیں ہے لوگ ابھی سیاہ پوش ہیں۔

اُس نے گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ کچھ فصل پر دونوں فوجی ٹرک تھے جن میں لڑکیاں بھری ہوئی تھیں۔ یہ مفتوحہ علاقے کا مالِ غنیمت نہ تھا، لکھنے والیاں تھیں جنھیں شہر شہر سے اکٹھا کیا گیا تھا اور جو اپنے سفر کا آخری دن بسر کر رہی تھیں۔ انھوں نے سیمینار میں لمبی لمبی تقریریں سنیں تھیں، انھیں ہالہ کے رنگین برتن دکھائے گئے تھے۔ بھٹ شاہ لے جایا گیا تھا، وہ امرکوٹ میں پھری تھیں، ضلع کونسلوں میں اعداد و شمار سنائے گئے تھے، گراف دکھائے گئے تھے جن کے خطوط نیچے سے اوپر کی طرف سفر کرتے تھے۔

اپنے اپنے شہروں میں رہتے ہوئے انھوں نے اس سندھ کو دیکھا تھا جو بڑے شہروں کے پنج ستارہ ہوٹلوں میں نظر آتا تھا۔ اونٹوں کی چمکتی ہوئی گھنٹیاں، حسین ترین رنگوں سے کاڑھے جانے والے جیومٹریکل ڈیزائن، رلیاں، رنگین پیڑھیاں، اجرکیں، فیروزی اور طاؤسی رنگ والے کاشی کاری کے برتن اور ٹائیلیں۔

لیکن جو سندھ انھیں دیکھتی آنکھوں نظر آ رہا تھا اس کی بستیوں سے زندگی شیشے کی گرگابیاں پہن کر کبھی نہیں گزری تھی۔ اس کے ڈنگر اور اس کے بچے ایک جوہڑ سے پانی پیتے تھے۔ اس کی عورتیں اٹھنیوں اور دھیلوں کے لیے مرچوں کے کھیت میں جھکے جھکے دُہری ہو گئی تھیں۔ ان کا تارِ نظر سرخ، سبز، اُودے، سیاہ اور نیلے صحرائی ٹانکوں کے ساتھ ہی کپڑوں کے ٹکڑوں میں اُتر گیا تھا۔ اُس کے مردوں کے بدن میں لہو، مٹیالا پانی بن کر رگوں سے گزرتا تھا۔ وہ جھلنگا چارپائیوں پر لیٹ کر آسمان کو تکتے تھے اور جب حریف کا خیال دل کو گرماتا وینی چھڈائن، پنجري، جوٹني اور بلھاڻ وکھیل کر دل کی تمام حسرتیں نکال لیتے تھے۔ انھوں نے میگھواڑوں کے گوٹھ اور بھراڑیاں دیکھی تھیں، انھیں ڈھاڈکی میں فریاد کرتے سنا تھا۔ تمام فریادیں بے کار تھیں، دادرسی کرنے والے عرش پر بیٹھے تھے اور ڈھاڈکی، تھری اور لاڑ سے واقف نہ تھے۔

جیپ نے ایک زور دار جھٹکا کھایا اور تہمینہ اپنی نشست سے گرتے گرتے بچی۔

"جوان۔ سنبھال کر چلاؤ"۔ کیپٹن رحیم نے کڑوے لہجے میں نائب صوبیدار علی خان کو تنبیہ کی۔

"یہ بہت خدائی خوار راستہ ہے۔ ٹرک والیوں کا حال تو بہت ہی تباہ ہو گا"۔ وہ معذرت خواہانہ لہجے میں عذرا اور تہمینہ سے مخاطب ہوا۔

"ٹرک والیاں تہمینہ بی بی کو دعائیں دے رہی ہوں گی۔ یہاں آنے کی تجویز انھی کی تھی"۔ پی آر او صاحب اپنی مونچھوں کے سائے میں مسکرائے۔

جیپ جس تنگ راستے سے گزر رہی تھی، اس کے دونوں طرف جھاڑ کے اونچے اونچے پیڑ تھے جن کے کانٹے جیپ کے دونوں پہلوؤں میں چبھ رہے تھے۔

"لیجیے بی بی۔ وہ رہا یادگاری چبوترہ"۔ پی آر او صاحب نے قدرے کھلے ہوئے علاقے کی طرف اشارہ کیا۔ صحرائی پیڑوں اور خار دار پودوں سے گھرا ہوا خاکستری رنگ کا ایک چبوترہ آنے والوں کی راہ دیکھ رہا تھا۔

جیپ سے اتر کر وہ لوگ اُس یادگاری چبوترے کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ چار دروں والے چبوترے کے اوپر ایک چھوٹا سا قبہ تھا اور فرش کے عین وسط میں چھوٹا سا پتھر نصب تھا جس پر اکبر کا سن پیدائش درج تھا۔ کسی منچلے نے اس یادگاری پتھر پر نشانہ بازی کی تھی، چھرّوں نے بیشتر حروف اُڑا دیے تھے یا بگاڑ دیے تھے۔

بے سر و ساماں ترک نژاد شاہ نے شگون کے طور پر نافۂ مشک کے ریزے اپنے وفاداروں میں یہیں تقسیم کیے تھے۔

ہنستی کھلکھلاتی ہوئی لڑکیاں ٹرکوں سے اتر کر چاروں طرف پھیل گئی تھیں۔ چبوترے سے چند گز کی دُوری پر جھاڑ کے پیڑوں کی اوٹ میں دو جھونپڑیاں نظر آ

رہی تھیں۔ ان میں رہنے والے باتوں کا قہقہوں کا شور سن کر باہر نکل آئے تھے اور ان کی بکریاں بھی ممیاتی ہوئی سامنے آکھڑی ہوئی تھیں۔

عذرا کو "ہمایوں نامے" کی وہ مغل تصویریں یاد آئیں جن میں اکبر کی پیدائش کا منظر ہے۔ حمیدہ بیگم چند عورتوں کی اوٹ میں لیٹی ہوئی ہے، ایک عورت اکبر کو گود میں اٹھائے ہوئے ہے اور پیڑوں کے درمیان تخت بچھا ہوا ہے۔ تخت پر ہمایوں متمکن ہے۔ خدام پشت پر مورچھل اٹھائے کھڑے ہیں۔ ایک درباری اکبر کی پیدائش کا مژدہ سنا رہا ہے اور کنیزیں رقص کر رہی ہیں۔

سورج مغرب کی طرف اترنے لگا تھا لیکن فضا کی تپش میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ تہمینہ نے پیاس کا اظہار کیا تو کیپٹن رحیم کے اشارے پر نائب صوبیدار عیسٰی خان جیپ سے Canteen نکال لایا۔ تہمینہ نے دو گھونٹ پی کر Canteen عذرا کی طرف بڑھا دی۔ ایک لمحے کے لیے عذرا کو تہمینہ کے اس دوست کا خیال آیا جس کا وہ نام بھی نہیں جانتی تھی اور جو قلعے میں تھا اور پھر اس نے Canteen تھام لی۔

وقت نے کچھ سے پانی کے دو گھونٹ چھین لیے تھے اور کچھ کو پانی کی تقسیم پر مامور کیا تھا۔

چنہ صاحب ٹہلتے ہوئے جھونپڑیوں کی طرف چلے گئے۔ چند منٹ بعد وہ پلٹے تو جھونپڑی والے اپنی چارپائیاں اور دھوپ کھائی رلیاں نکال لائے اور سایہ دار جگہ پر بچھانے لگے۔ سب ہی تھک گئے تھے اس لیے چنہ صاحب نے نہ صرف آرام کا انتظام کیا تھا بلکہ آدھ گھنٹے بعد سب کو بکری کے دودھ کی چائے بھی ملنے والی تھی۔

جس کو جہاں جگہ ملی وہیں ٹک گیا۔ تہمینہ اور عذرا ایک پیڑ کے نیچے جا بیٹھیں۔ اور ان دو لڑکیوں کو دیکھنے لگیں جو بڑی تندہی سے بکریاں دوہنے میں جُٹ گئی تھیں۔

"تمھارا دوست کب سے قلعے میں ہے؟" عذرا نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا۔

"سات مہینے سے۔"

عذرا کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ تہمینہ سے اور کیا پوچھے، کیا بات کرے۔ تہمینہ نے ریت پر سات کو تیس سے ضرب دیا اور پھر دو سو دس دنوں کو چوبیس سے ضرب دینے لگی۔ چند لمحوں تک عذرا اس کے سبک ہاتھ کی جنبش کو دیکھتی رہی پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ریت پر لکھے ہوئے اعداد، ریت میں ملا دیے۔

"حواس کھو نہ بیٹھنے کے لیے کبھی کبھی یہ ضروری ہوتا ہے کہ ضرب، تقسیم، جمع، تفریق بھلا دی جائے۔ اعداد بھلا دیے جائیں، دن اور ساعت کا حساب بھلا دیا جائے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو لیکن بعض اوقات میرے ذہن پر سیاہی کی چادر سی تن جاتی ہے۔ اس وقت بھی میری یہی کیفیت ہے۔ اس جیپ میں سفر کر کے، اس Canteen کے پانی سے حلق تر کر کے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے عابد سے غداری کی ہے۔"

"پھر تو سانس لینا، اپنے کمرے سے قدم باہر نکالنا اور لوگوں سے بات کرنا بھی غداری ہے۔"

وہ دونوں اسی طرح باتیں کرتی رہیں، قہقہوں کا اور باتوں کا شور کم ہوتا گیا شاید سب ہی تھک گئے تھے۔ تب اچانک عذرا کی نظر چبوترے کی طرف اٹھی۔

وہاں ایک مورنی اپنے پر سمیٹے کھڑی تھی، پھر جھاڑیوں سے پھڑپھڑاہٹ کی آواز آئی اور ایک مور اڑ کر چبوترے پر آ کھڑا ہوا۔ مورنی نے گردن گھما کر اسے دیکھا، جھوم کر دو قدم آگے بڑھی اور اکبر کے بن پیدائش پر ٹھونگ مارنے لگی۔ مور نے جھنکار کر ادھر ادھر دیکھا پھر پروں کو پھلا کر جھومتے ہوئے مورنی کے گرد پھرنے لگا۔

عذرا کے لیے اور تمام لڑکیوں کے لیے یہ ایک ناقابلِ یقین اور یادگار منظر تھا۔

سندھ کے تمام رنگ ان دو پرندوں میں سمٹ آئے تھے۔

"ہائے اللہ۔ کوئی ان دونوں کو پکڑ لے"۔ اُس لڑکی کی آواز آئی جو ہمیشہ بے موقع بولتی تھی، جس کا چہرہ روج کی زیادتی سے ہر وقت سرخ رہتا تھا اور جس کا نام پہلے ہی دن بہو گوشہ رکھ دیا گیا تھا۔

"حُسن کو کہیں تو آزاد رہنے دو۔ زیادہ ہائے اللہ کرو گی تو دونوں اڑ جائیں گے"۔ عذرا نے جھنجھلا کر کہا۔

سب نے ایک دوسرے کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ایک ٹک چبوترے کی طرف دیکھتے رہے۔

مور ٹھمکتا ہوا مورنی کے گرد پھرا لیکن جب توجہ نہ ملی تو حلق سے پیہو کی آواز نکالی، پوٹا پھول گیا، ہفت رنگ پر آہستہ آہستہ کُھلنا شروع ہوئے، یوں جیسے سات چمکدار رنگوں کی پنسلیں پرکار میں ایک ساتھ لگا دی گئی ہوں اور پرکار نصف ہفت رنگ دائرہ کھینچتی چلی جائے۔

وہ جو عہدِ قدیم میں دیوی ہیرا کا خاص پرندہ تھا اور مندروں میں رہتا تھا۔۔ وہی اپنے پر پھیلا کر چبوترے پر دائیں بائیں چند قدم چلا پھر جھنکارتے ہوئے رقص کرنے لگا۔

ہوا تھم گئی تھی، پیڑ اور پودے ساکت تھے، ہر شخص تصویر بن گیا تھا۔ اوپر نیلا آسمان تھا، نیچے صحرا کی زمین تھی اور ان دونوں کے درمیان دھوپ کا سنہری پن تھا۔ جس میں توس قزح سانس لیتی تھی۔ کائنات کے سب رنگ اُن پروں میں سمٹ آئے تھے، جزو کُل میں بدل گئے تھے، لازوال اور دائمی روح کا اشارہ بن گئے تھے۔ پروں پر کُھلی ہوئی متعدد آنکھیں انہیں دیکھ رہی تھیں، گھوم گھوم کر جھوم جھوم کر۔ وہ آنکھیں لاجوردی آسمان پر پلک جھپکتے ہوئے تارے بن گئی تھیں۔

مورنی پھُریری لے کر اور پر کھول کر سامنے آئی، آگے بڑھ کر ناچتے ہوئے مور کی

چونچ سے چونچ ملائی، ناچتا ہوا مور چند لمحوں کو تھما، ان کی چونچوں نے مل کر دانا پلٹی کی پھر دونوں جھنکارتے ہوئے الگ ہوئے اور رقص کرنے لگے۔

ایرانی قالینوں پر شجرِ حیات کے دائیں اور بائیں کڑھے ہوئے دونوں مور زندہ ہوگئے تھے اور ترک نژاد شہنشاہ کی جائے پیدائش پر اتر آئے تھے۔

اچانک عذرا کو اپنے دائیں جانب کسی حرکت کا احساس ہوا، اُس نے پلٹ کر دیکھا اور تڑپ کر ہاتھ بڑھایا لیکن بہت دیر ہوگئی تھی۔ کیپٹن رحیم کے ریوالور نے تولہ بھر سیسہ اُگلا اور پندرہ سترہ گز دور چبوترے پر ناچتے ہوئے، جھنکارتے ہوئے مور نے جھونک کھائی، اُس کے لاجوردی، سبز اور سنہری پَر ہوا میں اُڑے اور خون کے چھینٹے اُڑاتا ہوا بدن پھڑکنے لگا۔ وہ طاؤس تھا یا تموز تھا۔ یہ طاؤس کا قتل تھا کہ تموز کا۔ تموز جس کی موت خزاں کی علامت تھی۔ جس کا ماتم عشتار کے ساتھ تمام کنواریاں اور تمام مزارع کرتے تھے۔

مورنی کے حلق سے ایک تیز چیخ نکلی، وہ پھڑپھڑاتی ہوئی اُڑی اور ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہوگئی۔

"عیسیٰ خان۔ حلال کرو۔" کیپٹن رحیم کی آواز کڑکی۔

"یس سر۔" نائب صوبیدار عیسیٰ خان لپک کر چبوترے پر چڑھ گیا۔ کھٹکے دار وزیرآبادی چاقو کھول کر عیسیٰ خان نے پھڑکتے ہوئے مور کو بائیں ہاتھ سے پکڑا اور کلمہ پڑھتے ہوئے دائیں ہاتھ سے چاقو گردن پر پھیر دیا۔

مہابلی اکبر کی سلطنت میں اتوار کے دن کوئی جانور ذبح نہیں ہو سکتا تھا اور آج بھی اتوار تھا۔ یہ اکبر کا یومِ سبت تھا۔

گولی کی آواز جھونپڑی والوں کو باہر لے آئی تھی۔ لیر لیر کپڑوں میں اپنے ننھے بدن کو چھپائے ہوئے ایک بچی آگے بڑھی۔ اُس نے چبوترے کی طرف دیکھا اور زمین پر

لوٹ گئی۔

"ھائے منھنجو شاھو۔ بابا منھنجو شاھو۔" اسکی سیاہ اوڑھنی زمین پر گر گئی۔ چہرہ اور بال خاک میں اَٹ گئے۔

سب ساکت تھے۔

تب عذرا آگے بڑھی اور اس بچّی کے پاس زمین پر دو زانو ہو گئی۔ اس نے خاک پر پڑی ہوئی سیاہ اوڑھنی اُٹھا کر بچّی کے سر پر ڈال دی کہ ایام عزا ابھی ختم نہیں ہوئے تھے اور اس کا دھول میں اٹا ہوا سر تھپکنے لگی۔ وہ اس بچّی کو کس طرح سمجھاتی کہ پہلے تو یوم سبت ہوتا تھا لیکن اب کوئی یوم۔ یوم سبت نہیں ہے۔

تتلیاں ڈھونڈنے والی

نرجس نے سفید سر والی اماں کو دیکھا جو سلاخ دار دروازے کے دوسری طرف بیٹھی تھیں اور جن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ بھیّا سر جھکائے ہوئے تھا۔ اُس کا چہرہ نرجس کو نظر نہیں آ رہا تھا۔

مہدی تالی بجا کر زور سے ہنسا پھر اُس نے سلاخوں کے درمیان سے اپنے دونوں ہاتھ باہر نکال دیے۔ "ممّا، میری ٹافی۔" وہ چہکا۔ تب بھیّا نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور مہدی کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ نمکین پانی کے قطرے مہدی کے گرد آلود ہاتھوں کو دھونے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔

نرجس نے دوسرے اچھے اور بُرے مناظر کی طرح اس منظر کو بھی اپنے اندر رکھ لیا۔ اُس کے دل کو تسلّی سی ہوئی۔ اماں نہیں رہیں گی تب بھی مہدی کے سر پر ہاتھ رکھنے والا تو رہے گا۔ بھیّا اُسے جی جان سے چاہتا تھا، وہ یقیناً مہدی کو بہت عزیز رکھے گا۔ بھیّا نے رحم کی اپیل پر دستخط کروانے کے لیے اُس سے

کیسی کیسی منتیں نہ کی تھیں لیکن نرجس کے لیے بس یہی ممکن نہ تھا۔ اپیل کا وقت گذر گیا تھا اور اب وہ موت کے مقابل تھی۔

اماں اُس کا ہاتھ یوں تھامے ہوئے تھیں جیسے تیرنے والے ڈوبنے والوں کا ہاتھ تھامتے ہیں۔ اس لمس میں بے بسی تھی، جُدائی تھی، بے پایاں الم تھا۔ یہ لمس باہر کی دُنیا سے اُس کا آخری رابطہ تھا۔ وہ دنیا جو حُسن اور بدصورتی سے، اچھوں اور بُروں سے، محبت اور نفرت سے بھری ہوئی تھی۔

مہدی کھلکھلاتا رہا۔ بھیّا سے باتیں کرتا رہا۔ کبھی دو سلاخوں کے درمیان سے اپنا ننھا سا چہرہ آگے نکال کر مما کا چہرہ چومتا رہا اور کبھی ہاتھ بڑھا کر نتا کے سفید بالوں سے الجھتا رہا۔

"اماں، اسی بار ۔۔ یہ خوش ہولیں کہ مہدی اب آزاد ہو جائے گا۔ اُس نے سلاخوں، ہتھکڑیوں، زنجیروں اور سنگینوں کے سوا دیکھا ہی کیا ہے۔ وہ یہیں پیدا ہوا۔ یہی بیرکیں اُس کی کل کائنات ہیں۔ اب وہ اسکول جائے گا، بازار جائے گا، باغ میں کھیلے گا۔ بھیا اسے جھُولے پر ضرور بٹھانا۔"

"آپا تمھیں خدا رسول کا واسطہ، چُپ رہو۔" بھیّا بلکنے لگا اور وہ خاموش ہو گئی۔ وہ اماں کی اور بھیّا کی اذیت، اُن کا عذاب سمجھتی تھی لیکن اُنہیں یہ نہیں سمجھا سکتی تھی کہ کبھی انسان اپنے لیے موت منتخب کرتا ہے کہ دوسرے زندہ رہیں۔ موت کے پیالے میں جب تک زندگی کے سِکّے نہ ڈالے جائیں، آدرش ہاتھ نہیں آتے۔

وہ اور حُسین ایک ساتھ ہی گرفتار ہوئے تھے پھر اطلاع آئی کہ تفتیش کے دوران حُسین نے خودکشی کر لی۔ وہ جانتی تھی کہ قاتل، مقتولوں کو خودکشی کرنے والے ہی کہتے ہیں۔ حُسین پر سے اُس کا ایمان ایک لحظے کے لیے بھی متزلزل نہیں ہوا تھا۔ وہ بھی اس کی طرح ضمیر کا قیدی تھا اور ضمیر کے قیدی خودکشی نہیں کرتے، ستم کی

درخواستیں نہیں گزارتے۔

آخری ملاقات کا وقت ختم ہوا تو اماں غش کھا گئیں۔ بھیا سلاخوں سے چمٹ گیا۔ وہ اس کے ہاتھوں کو پیار کر رہا تھا اُس کے بالوں کو چھو رہا تھا۔ پھر وہ لوگ چلے گئے۔ نہیں، وہ لوگ گئے نہیں، لے جائے گئے۔ نرجس کا کیسا جی چاہا تھا کہ ایک بار، آخری بار بھیا کو سینے سے لگا لے لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ جیل کے آداب انسانوں نے بنائے تھے۔ اُن سے انسانی رشتوں اور جذبوں کا خیال لاحاصل تھا۔

ممّا چلا گیا تو مہدی بلکنے لگا۔ وہ وہاں جانا چاہتا تھا جہاں کی کہانیاں امّی نے سنائی تھیں لیکن امّی تو اسے کہیں بھی نہیں جانے دیتی تھیں۔

"کل چلے جانا۔ ممّا تمہیں کل لے جائیں گے۔" نرجس مہدی کے رخسار چومنے لگی۔

وارڈن مریم نے ماں اور بیٹے پر ایک نظر ڈالی اور سر جھکا لیا۔ یہ کیسی عورت تھی جس نے موت کی سزا کے خلاف رحم کی اپیل نہیں کی تھی، جس نے پھانسی گھر پہنچ کر ایک آنسو نہیں بہایا تھا، چیخیں نہیں ماری تھیں، خدا سے لے کر جیلر تک، کسی کو بھی گالیاں نہیں دی تھیں۔

یہ عجیب عورت تھی کہ جب اُسے قرآن دیا گیا تو اُس نے اُسے آنکھوں سے لگا کر ایک طرف رکھ دیا اور اپنے بیٹے کو چومتی رہی۔ مولوی صاحب نے آکر اُسے نماز پڑھنے کی، بارگاہِ رب العزت میں توبہ استغفار کرنے کی ہدایت کی تو وہ مسکراتی رہی۔ مولوی صاحب کے جانے کے بعد اُس نے جانماز اپنے تکیے کے نیچے رکھ دی۔ پھر تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور اپنے بیٹے کو کہانیاں سُنانے لگی۔

زنانہ وارڈ کیسی کیسی مجرم و ملزم عورتوں سے بھرا ہوا تھا لیکن نرجس اُن سب کو اپنے آپ میں سے نہیں لگتی تھی۔ گذشتہ چار برسوں میں اُن بُری عورتوں نے اُسے بہت اچھی طرح رکھا تھا۔ وہ ان کی سمجھ سے بالاتر تھی اسی لیے وہ اُس سے محبت

کرتی تھیں، اُس کا احترام کرتی تھیں، اُس سے خوف کھاتی تھیں۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب اُس نے کسی کی ناک چُٹیا نہیں کاٹی، کسی کے مویشی نہیں چرائے، کچی شراب اور چرس نہیں بیچی، کسی کو قتل نہیں کیا تو پھر اُسے کن گناہوں کی اتنی بڑی سزا ملی ہے۔

"بی بی تمہیں ڈر نہیں لگتا؟" پھانسی گھاٹ منتقل ہونے کے چند دن بعد وارڈن مریم نے اُس سے پوچھا تھا۔

"کس بات سے ڈر؟" نرجس کے لہجے میں سکون تھا۔

"موت سے۔"

"نہیں، موت جب اپنا اختیار ہو تو اُس سے ڈر نہیں لگتا۔ پھر مہدی بھی تو ہے۔ وہ میرے بعد رہے گا اور میں اُس میں رہوں گی پھر جب وہ چلا جائے گا تو میں اُس کے بچوں میں زندہ رہوں گی۔"

مریم نے اُس کے بعد نرجس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ ہاں بیرکوں میں یہ بات ضرور گھوم گئی تھی کہ پھانسی گھر میں جو بی بی بند ہے وہ بہت پہنچی ہوئی ہے۔ اُسے بشارت ہوئی ہے کہ وہ اپنے بعد بھی رہے گی۔ ہاتھی کے کلیجے والی ہے۔

نرجس نے محسوس کیا تھا کہ اُس کے سامنے پہنچ کر لیڈی وارڈنوں کی نگاہیں جھک جاتی ہیں، سپرنٹنڈنٹ جیل کو اُس کی کوٹھری سے جانے کی جلدی ہوتی ہے اور صبح و شام جب وہ اپنی کوٹھری سے باہر نکالی جاتی ہے تو ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔ لڑتی ہوئی، شور مچاتی ہوئی عورتیں خاموش ہو جاتی ہیں اور سلاخ دار دروازوں کے پیچھے سے اُسے یوں دیکھتی ہیں جیسے وہ اُن میں سے نہیں ہے کہیں اور سے آئی ہے۔

وہ کھانا، وہ آخری کھانا کس اہتمام سے آیا تھا۔ THE LAST SUPPER

اُسے بڑے آرٹسٹوں کی تصویریں یاد آئیں۔ مہدی اس کھانے کو دیکھ کر کس قدر خوش ہوا تھا۔ "آج کھانا بہت مزے کا ہے امی۔" اُس نے ماں کے گلے میں باہیں ڈال دی تھیں۔

"ہاں میری جان، سچ کہتے ہو۔" نرجس نے اُسے نوالہ بنا کر دیتے ہوئے نگاہیں جھکالی تھیں کہ مہدی اُن آنسوؤں کو نہ دیکھ لے جو پلکوں کی چلمن سے لگے بیٹھے تھے۔

پھر رات ہو گئی۔ مہدی اُونگھنے لگا لیکن نرجس اُس سے جی بھر کر باتیں کرنا چاہتی تھی، اس کی آواز سُننا چاہتی تھی۔ وہ اُسے تادیر جگانا چاہتی تھی تاکہ وہ لوگ پَو پھٹنے سے پہلے جب اسے لینے آئیں تو وہ میٹھی نیند سو رہا ہو۔

نرجس نے اُس کی روشن آنکھوں کو دیکھا، اُس کے خوبصورت ماتھے کو دیکھا۔ یہ حُسین کی آنکھیں تھیں، یہ حُسین کا ماتھا تھا۔ اس بدن سے حُسین کی خوشبو پھوٹتی تھی۔ حُسن کی، زندگی کی، اُمید کی خوشبو۔ حُسین اب جبکہ تم کہیں نہیں ہو تو کیا اب بھی تم کہیں رہتے ہو؟ زمین و آسمان کے درمیان؟ اُس کے لہو میں بھنور پڑنے لگے۔ اُس نے مہدی کو اپنے سینے میں سمیٹ لیا۔

"بہت زور کی نیند آرہی ہے امّی۔" مہدی نے فریاد کی۔

"میری جان، بس ابھی کچھ دیر میں سو جانا۔ مجھ سے تھوڑی سی باتیں اور کر لو۔" نرجس کی آواز لرزنے لگی۔ "کل صبح تمہیں ممّا اپنے گھر لے جائیں گے۔ وہ تمہیں کہانیاں سنائیں گے، بازار لے جائیں گے، جاؤ گے نا؟"

"سچ امّی؟ ہمارے ساتھ آپ بھی بجا رہیں گی نا؟" مہدی نیند کو بھول کر اٹھ بیٹھا۔

"میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی بیٹے۔"

"تو کیا آپ اسی گھر میں رہیں گی؟"

"نہیں بیٹے۔ میں تمہارے لیے تتلیاں ڈھونڈنے جاؤں گی۔"

راہداری میں آہٹ ہوئی۔ نرجس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وارڈن مریم سلاخیں تھامے اُن دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"امّی کل تتلیاں ڈھونڈنے جائیں گی۔" مہدی نے خوش ہو کر مریم کو بتایا۔

"ہاں راجا۔ امّی سے خوب باتیں کر لو، خوب پیار کر لو۔" مریم کی آواز ٹوٹنے لگی اور وہ جلدی سے مُڑ گئی۔

"آپ شام تک تو آ جائیں گی نا؟"

"نہیں مہدی، تتلیاں بہت تیز اُڑتی ہیں۔ میں اُنہیں ڈھونڈنے نکلوں گی تو بہت دُور چلی جاؤں گی۔"

"آپ کون سی تتلی ڈھونڈیں گی؟"

نرجس ایک لمحے کے لیے رُکی۔ "آزادی کی تتلی میری جان۔" اُس نے بیٹے کے بال چُوم لیے۔

"وہ کس رنگ کی ہوتی ہے؟"

"اُس میں دھنک کے ساتوں رنگ ہوتے ہیں۔"

"دھنک کیسی ہوتی ہے؟"

"اس بار جب مینہ برسے تو مماّ سے کہنا وہ تمہیں دھنک دکھا دیں گے۔"

"پھر میں بھی دھنک تتلیاں ڈھونڈوں گا۔"

"نہیں میری جان، دھنک تتلیاں تمہارے پاس آپ سے آپ آ جائیں گی۔ ہم اسی لیے تو انہیں ڈھونڈنے نکلے ہیں کہ تمہیں ہماری طرح سفر نہ کرنا پڑے۔" نرجس کا بدن لرزنے لگا۔ وہ دیوانہ وار اس کی بے داغ گردن چومنے لگی۔ اس ایک ہفتے کے دوران اس کی آنکھوں سے پہلی مرتبہ آنسو گر رہے تھے۔

مہدی سو گیا تو نرجس نے اُسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ مہدی کے وجود میں امید کا پودا نمو پا رہا تھا اور اُسی امید نے اس کے سینے میں ہاتھی کا کلیجہ رکھ دیا تھا۔ اُسے آنے والے زمانوں میں زندہ رہنے کی بشارت دی تھی۔

آس پاس کی بیرکوں سے آیتیں پڑھنے اور کلمہ دُہرانے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی عورت بڑی خوش الحانی سے سورۂ رحمٰن کی تلاوت کر رہی تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ آج بی بی رُخصت ہونے والی ہے اور یہ اُسی کی رخصت کی تیاریاں تھیں۔

اُس کے سینے میں کسی نے برچھی ماری۔ بھیا صدر دروازے کے سامنے خاک پر بیٹھا ہو گا۔ اُس نے جب شماریات میں ایم ایس کیا تھا تو اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ کبھی وہ آپا کی زندگی کی ساعتوں کو شمار کرے گا اور بالکل تنہا ہو گا۔

چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے چک پھیریاں کھانے لگے۔ مہربان اور نامہربان چہرے۔ اجنبی اور آشنا آوازیں۔ نرجس کو اُن آوازوں پہ بے ساختہ پیار آیا جو اس کا آخری سفر آسان کرنے کے لیے اپنی نیندیں قربان کر رہی تھیں۔ ایک ہفتہ پہلے تک وہ اِن آوازوں کے ساتھ تھی لیکن یہ آوازیں اُسے ذرا بھی تو نہیں سمجھتی تھیں، اُس کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتی تھیں۔

جس دن رحم کی اپیل کی مدت ختم ہوئی اور اطلاع آئی کہ سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل اُسے بیرک سے پھانسی گھر منتقل کرنے کے لیے آ رہے ہیں تو ہر طرف سناٹا تھا۔ وہ اور مہدی بیرک سے رخصت ہوئے تو اُس نے بعض عورتوں کو چُپکے چُپکے آنسو پونچھتے اور چہرے جُھکاتے ہوئے دیکھا۔ یہ وہ عورتیں تھیں جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو گالیاں دیتی تھیں، گریبان تار تار کرتی تھیں اور جنہیں علیحدہ کرنے کے لیے میٹرن اور وارڈن کو بید کا آزادانہ استعمال کرنا پڑتا تھا۔

نرجس کو نیند کا جھونکا چھو کر گزرا۔ اس کا دل اینٹھنے لگا۔ مہدی کا دل اس کے

دل کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ اس ننھے سے دل کا دھڑکتے رہنا ہی موت کے سامنے اس کی سب سے بڑی جیت تھی۔ وہ اپنے بعد بھی رہے گی۔ لیکن روح کیا تھی اور اگر تھی تو بدن سے نکل کر کہاں قیام کرتی تھی۔ حسین کہاں تھا؟ کہیں بھی نہیں۔ سب کچھ فنا ہو گیا تھا۔ فنا کا مطلب کیا ہے، لغوی طور پر اُسے معلوم تھا لیکن حواس خمسہ کی سطح پر بس معلوم ہونے ہی والا تھا۔

"بی بی" مریم نے سلاخوں کے پاس آکر دھیرے سے اُسے آواز دی۔

"ہاں؟" اُس نے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"راجا کو بستر پہ لٹا دو بی بی۔ وہ لوگ آ رہے ہیں۔" مریم کی آواز تڑخنے لگی۔

ایک لحظے کے لیے نرجس کو زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر سنبھل کر اُس نے کروٹ لی اور سینے سے لپٹے ہوئے مہدی کو بستر پہ لٹا دیا۔ اِسے بھلا میری صورت کیا یاد رہے گی۔ اِس کے لیے تو میں محض ایک نام، ایک خیال رہوں گی۔

"ساری خطائیں معاف کر دینا بی بی، ہم ردّی اسی کی کھاتے ہیں۔ پیٹ بڑا بدکار ہے بی بی۔" مریم سلاخوں سے سر ٹکا کر بلکنے لگی۔ نرجس نے چارپائی سے اُتر کر دونوں ہاتھ سلاخوں سے باہر نکالے اور مریم کا شانہ تھام لیا۔ لفظ بے کار تھے۔ بھاری قدموں کی چاپ قریب آئی تو نرجس نے مریم کا بازو تھپتھپایا۔ اُس نے سر اٹھا کر لبریز آنکھوں سے نرجس کو دیکھا۔ سفید ململ کے دوپٹے سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور اٹین شن کھڑی ہو گئی۔

مریم نے تالے میں چابی گھمائی اور پھر جس قدر آہستگی سے ممکن تھا دروازہ کھول دیا۔ آہنی دروازے کو سپرنٹنڈنٹ جیل نے دھکا دیا تو دیوار سے ٹکرا کر آواز ہوئی۔

"صاحب جی بچہ سو رہا ہے، جگ نہ جائے" وارڈن مریم نے حدِ ادب کو

عبور کرتے ہوئے آنے والوں کو لجاجت سے یاد دلایا۔

"اچھا بک بک مت کرو، بڑی آئی نیچے کی سگی" سپرنٹنڈنٹ نے اس کو تیز آواز میں جھڑکا۔

"Sir, I request you not to talk loudly"

نوجوان مجسٹریٹ نے ایک نظر سوئے ہوئے مہدی پر ڈالی اور پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

سپرنٹنڈنٹ کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ یہ نئے افسر اپنے آپ کو جانے کیا سمجھتے ہیں۔ اُس کا منہ کڑوا ہو گیا۔ پھر اُس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے ضابطے کی کارروائی شروع کر دی۔ اس نے پہلے نرجس کو شناخت کیا پھر ایک کاغذ کھول کر دفتری لہجے میں بہ آوازِ بلند پڑھنے لگا۔ یہ کاغذ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہو کر اس مفہوم پر ختم ہوا کہ مجرمہ کے گلے میں پھانسی کا پھندا اُس وقت تک پڑا رہے جب تک کہ اُس کا دم نہ نکل جائے۔

میڈیکل افسر نے آگے بڑھ کر نرجس کی نبض دیکھی، دل کی دھڑکن سُنی اور آہستہ سے سر ہلا دیا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے اس سے چند کاغذوں پر دستخط کرائے۔ نوجوان مجسٹریٹ نے اُن دستخطوں کی تصدیق کی اور سپرنٹنڈنٹ کوٹھری سے باہر نکل گیا۔

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے وارڈن مریم کو اشارہ کیا۔ وہ اندر آئی۔ اُس کا چہرہ جیسے کانسی میں ڈھل گیا تھا۔ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ نرجس کے دونوں ہاتھ تھام کر پشت پر لے گئی اور انہیں چمڑے کے تسمے سے باندھنے لگی۔ نرجس نے اس کی انگلیوں کی لرزش اور نرمی کو محسوس کیا۔ وہ تنہا نہیں تھی۔ باہر بہت سے لوگ تھے، اندر بھی بہت سے لوگ تھے۔ تمام برجوں پر اس وقت رائفل بردار دل کا پہرا ہو گا۔ صدر دروازے پر بارہ وارڈنوں کی ایک پلٹن تعینات ہو چکی

ہو گی۔ اُن سب کی رائفلوں میں دس دس گولیاں ہوں گی اور اُنہی کے مقابل خاک پر بھیا بیٹھا ہو گا۔

مہدی کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ میٹرن کے اشارے پر مریم نے اُس کا بازو تھاما "چلو بی بی"۔

وہ ایک قدم بڑھی پھر پلیٹ کر اُس نے مہدی کو دیکھا۔ وہ کلبلا رہا تھا، سسکیاں لے رہا تھا۔ شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہے۔ نرجس کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ آنکھوں کی دہلیز تک آنے والے آنسوؤں کو اُس نے بہ جبر دھکیلا۔ وہ اُن لوگوں کے سامنے تھی جنہوں نے اُس کی اور اُس جیسے دوسروں کی روح کو شکست دینے کی تمام کوششیں کی تھیں لیکن وہ اُن سے ہاری نہیں تھی تو اب آخری لمحوں میں اُنہیں فتحمندی کے ذائقے سے آشنا کیوں کرے۔

نوجوان مجسٹریٹ کی نگاہوں نے اُس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ "بچہ کہاں رہے گا؟" اُس نے میٹرن سے پوچھا۔

"بچے کا ماموں باہر انتظار کر رہا ہے جی"۔

نرجس کے سینے پر گھونسا لگا۔ بھیا کو اُس نے کس امتحان میں ڈال دیا تھا۔

مجسٹریٹ کی پیشانی پُرشکن تھی۔ اُس نے نرجس پر ایک گہری نظر ڈالی پھر راہداری میں کھڑی ہوئی ایک وارڈن کو آواز دی۔

"جی صاحب"۔ وارڈن اندر آگئی۔

"بچے کو گود میں اٹھا لو۔ ذرا احتیاط سے"۔

"صاحب جی، میں اٹھا لوں؟" مریم کی آواز سرتاپا التجا تھی۔

"چلو تم ہی سہی۔ اسے بی بی کے ساتھ لے کر چلو"۔

"لیکن یہ تو جیل مینول کے ....." ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے مداخلت کرنی چاہی۔

"To hell with the jail mannual"
نوجوان مجسٹریٹ نے کہا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ مریم نے آگے بڑھ کر مہدی کو اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ وہ فوراً ہی چُپ ہو گیا۔

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی سرکردگی میں قافلہ روانہ ہوا۔ دو سپاہی آگے چل رہے تھے اور دو پیچھے۔ درمیان میں وہ تھی اور اس کے دائیں بائیں مریم اور دوسری وارڈن چل رہی تھی۔ چلتے ہوئے بھی نرجس کی نگاہیں مہدی پر جمی ہوئی تھیں۔

باہر مئی کے مہینے کی رات میں پَو پھٹنے سے پہلے کی خوشگوار خنکی رچی ہوئی تھی۔ ڈوبتے ہوئے چاند کی روشنی میں اُس نے تختۂ دار کو دیکھا۔ سیڑھیاں اُسے نظر آ رہی تھیں۔ موت تو پاتال میں اُترنے کا نام ہے، اس پاتال میں اُترنے کے لیے سیڑھیاں کیوں چڑھنی پڑتی ہیں؟ اُسے جلاد نظر آیا۔ آج اُس کے بچے کتنے خوش ہوں گے۔ باپ کو آج پھانسی بھتہ ملے گا۔ دس روپے۔ دس روپے تو بہت ہوتے ہیں۔ ان روپوں سے کئی چیزیں خریدی جا سکتی ہیں۔ نرجس کا ذہن بھٹک رہا تھا۔ لیکن اس کے پیروں میں کوئی لرزش نہ تھی۔ اچانک وہ رُک گئی۔ "مریم"۔ اس کی آواز سناٹے میں بجلی کی طرح چمکی۔

"حکم دو بی بی"۔ وارڈن مریم کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ جانے کون حاکم تھا اور کون محکوم۔ اُس نے مریم کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ مریم اُس کے سامنے جُھک گئی۔ پشت پر بندھے ہوئے نرجس کے دونوں ہاتھ مہدی کو چھونے کے لیے پھڑک کے پھر اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ مہدی نیند میں ہنس رہا تھا، شاید پریوں سے کھیل رہا تھا۔ نرجس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے زندگی کو دیکھا پھر آہستہ سے اُس کا ماتھا چُوما، رخسار چُومے، زندگی، زندگی سے رخصت ہو رہی تھی۔
وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ تختۂ دار پر پہنچی تو سرکاری جلاد اُس کے قدموں میں جُھکا

اور تسمے سے پیر باندھنے لگا۔ نرجس نے اوجھل ہوتے ہوئے منظر پہ ایک نظر ڈالی پھر اُسے بھی اپنے اندر رکھ لیا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور منظر اُس کے اندر تھا۔ وہ جانتی تھی کہ چاند ڈوب رہا ہے۔ صبح کا ستارہ طلوع ہو گیا ہے۔ مہدی پریوں سے کھیل رہا ہے۔ سُورج کا ظہور ہونے والا ہے اور اللہ کے بابرکت نام سے شروع ہونے والے حکم نامے پر عمل درآمد کا وقت آ پہنچا ہے۔